ابوالبرکات سید ذکی الدین ترمذی بلوی
اردو مدرس اورینٹل کالج لاہور

نقد

قیمت فی کاپی ۱۰ر

تصانیف نیاز فتحپوری

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے و ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے اس لئے ضخامت بھی زیادہ ہے۔

قیمت تین روپیہ
علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جسمیں حسن زبان قدرت بیان اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئیگا ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے

قیمت چار روپیہ
علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جسمیں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں، حضرت نیاز کی انشا نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔

قیمت دو روپیہ
علاوہ محصول

مختارات نیاز

حضرت نیاز فتحپوری کے افسانوں کا چوتھا مجموعہ، اس میں اکثر و بیشتر وہ وہ افسانے شامل ہیں جو دوسری زبانوں سے لئے گئے ہیں اور اپنی دلچسپی و افادیت کے لحاظ سے خاص درجہ رکھتے ہیں۔ اس مجموعہ کے مطالعہ سے آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ دوسری زبانوں کے افسانے کیونکر اپنی زبان میں لینا چاہئے کہ وہ ترجمہ نہ معلوم ہوں، مجلد نہایت عمدہ طباعت و کاغذ و نفیس گرد پوش کے ساتھ قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ

مکتوبات نیاز دو حصوں میں

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں بالکل نئی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں، اس اڈیشن میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کر دیا گیا ہے اور ۲۶ پونڈ کاغذ پر طباعت ہوا ہے۔

قیمت ہر حصہ تین روپیہ
علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان و تخیل اس کی نزاکت بیان اس کی بلندی مضمون اور اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔

یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوش خط ہے۔

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ
علاوہ محصول

ترغیبات جنسی یا شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات انکی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی نیز یہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ نیا اڈیشن

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

مجموعۂ استفسار و جواب

(حصہ ۲-۳)

اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بے کار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان دونوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی مسایل شامل ہیں اور اس کی حیثیت ایک مختصر سی سائیکلوپیڈیا کی ہے۔

قیمت فی جلد تین روپیہ
علاوہ محصول

جھانسی کی رانی

نیاز فتحپوری کے قلم سے اس ڈرامہ سے نہ صرف ۱۸۵۷ء کے ان واقعات پر روشنی پڑتی ہے جو ہندوستان میں برطانوی راج کے قیام کا باعث ہوئے، بلکہ راجاؤں کے ان اندرونی اختلافات کا بھی حال معلوم ہوتا ہے جو ملک کو غیر ملکیوں کے ہاتھ میں دیدینے کا بڑا سبب تھے اس ڈرامہ کے وہ حصے خصوصیت کے ساتھ بہت دلچسپ ہیں جن میں رانی کی زندگی کے آخری لمحات کا حال بیان کیا گیا ہے۔ قیمت دو روپیہ چار آنہ

اصحاب کہف

یہ ڈرامہ ایک مصری انشاء پرداز "توفیق الحکیم" کی کتاب "اہل الکہف" کا ترجمہ ہے۔ جس میں فاضل مصنف نے نہایت لطیف انداز سے "اصحاب کہف" کی روایت پر عاقلانہ تبصرہ کیا ہے، اس تمثیل کی جان وہ حصہ ہے جہاں موضوع محبت پر گفتگو کی گئی ہے اور اس کی ابدیت کو بالکل اچھوتے انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ ترجمہ حضرت نیاز نے کیا ہے۔

قیمت ایک روپیہ بارہ آنہ

زیب دیتا ہے اسے جسقدر اچھا کہئے

مرزا غالبؔ نے یہ مصرع بادشاہ کے ہاتھ میں
چکنی ڈلی دیکھ کر کہا تھا مگر دنیا آجکل اسے

نکٹائی مارکہ

مال استعمال کرکے پڑھتی ہے

ہر قسم کا زردہ، مشکی قوام، دانہ الائچی، تیل، عطر، عرق کیوڑہ و گلاب اور مختلف قسم کے پان مسالوں کو مشرقی نفاست اور طبی احتیاط کے ساتھ طیار کرنے والا مشرقی ہندوستان کا قدیم ترین کارخانہ آپ کی فرمائشات کا منتظر ہے

فہرست طلب فرمائیے

ٹیلی گرام: "مشکی قوام ہوڑہ"

ٹیلی فون: "ہوڑہ ۴۵۵"

نکٹائی برانڈ زردہ فیکٹری - ۱۴۱ ہوڑہ روڈ - ہوڑہ

فاسد مادہ کے بغیر
جراثیم مرض پیدا نہیں کر سکتے
خون صاف رکھنا نہایت ضروری ہے

قدیم یونانی نظریہ کی تائید میں جب ڈاکٹر اسپیکو فریر وفیسر ویانا یونیورسٹی نے فیصلہ کر لیا کہ مادہ کے بغیر جراثیم مرض پیدا نہیں کر سکتے تو ایک دن انھوں نے ایک عجیب و غریب مظاہرہ کیا وہ کلاس پڑھا رہے تھے، اُن کے ہاتھ میں ایک ٹیسٹ ٹیوب تھی جس میں ہیضہ کے زندہ جراثیم موجود تھے جو ایک پوری رجمنٹ کو ہلاک کرنے کے لئے کافی تھے۔ ڈاکٹر نے ان سب جراثیم کو نگل لیا مگر اس خطرناک تجربہ کا نتیجہ سوائے ہلکی سی تکلیف کے اور کچھ نہ ہوا، آخر کیوں؟ ہیضہ کے زندہ جراثیم نے ڈاکٹر کو ہلاک کیوں نہیں کر ڈالا! صرف اس لئے کہ ڈاکٹر کا خون فاسد مادوں سے صاف تھا

اور یہی ڈاکٹر کا دعویٰ تھا

یقیناً جراثیم کو مارنا قطعاً غلط ہے، اصل چیز جسم و خون کو فاسد مادوں سے صاف رکھنا ہے۔ **صافی** اسی اُصول کے پیشِ نظر تیار کی گئی ہے خون کو صاف رکھتی ہے اور جسم کی قوت مدافعت کو مرض کے خلاف قوی رکھتی ہے

قیمت فی شیشی ایک روپیہ

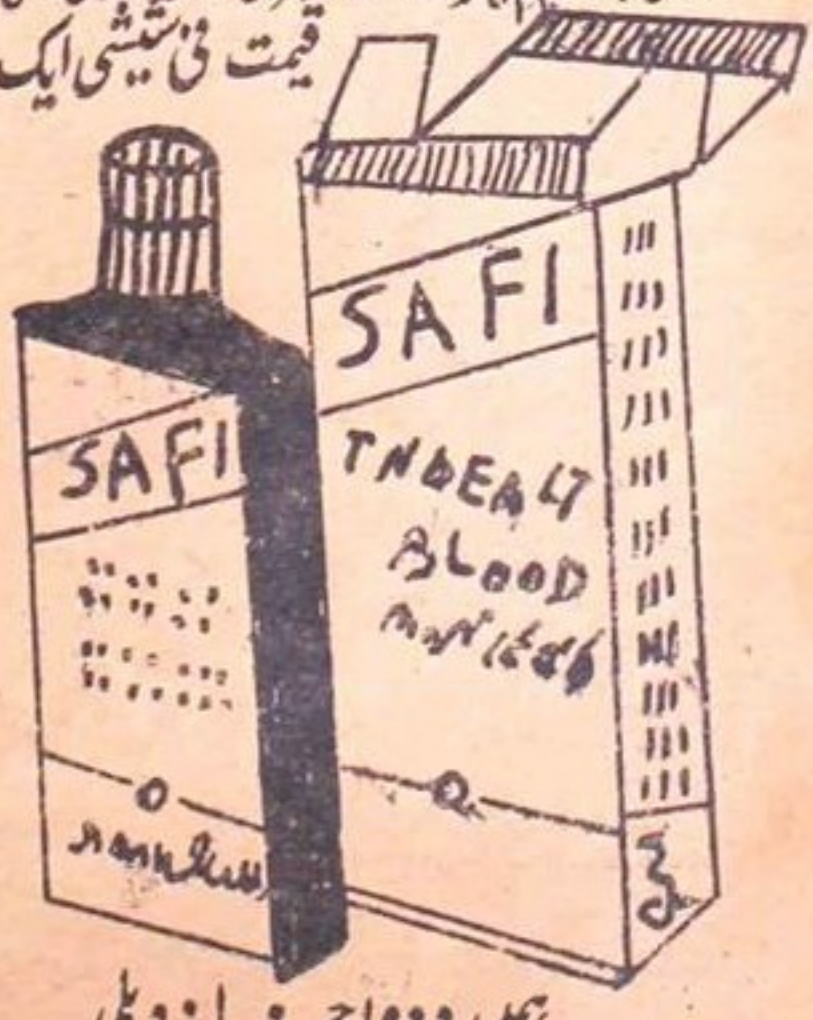

صافی

Hamdard

ہمدرد دواخانہ دہلی

خون صاف کرنے کی قدرتی دوا

اگست کے بعد رعایت بند

مکتوبات نیاز حصّۂ سوم اور مالہ وما علیہ

دونوں معہ محصول پانچر روپیہ میں

صرف اگست ۴۸ء کے اختتام تک مل سکتی ہیں، اس کے بعد رعایت بند ہو جائے گی

جلد ۵۴	فہرست مضامین اگست ۴۸ء	شمار ۲

ملاحظات ۴

مرزا داغ اور منی بائی حجاب .... سید رفیق مارہروی ... ۹

کیا روس جنگ کے لئے طیار ہے ۲۱

آل احمد سرور کی تنقید نگاری ..... محمد عظیم ۲۴

یہ انسان ہے ؟ ..... جمیل مہدی ۳۳

نوروز اور مینا بازار ..... مقبول احمد صمدانی ... ۳۸

سنجر کاشانی ..... پروفیسر نذیر احمد ام اے .. ۴۴

باب الانتقاد ..... درویش میرٹھی ۵۰

باب الاستفسار - شریعت اسلامی و پاکستان ۵۶

اے انقلاب (نظم) .... ادیب سہارنپوری ۶۲

کلام جمیل - نازش پرتاپ گڈھی ۶۳

رباعی .... شاد بنگلوری ۶۴

نگار کا آیندہ سالنامہ

فسانہ نمبر ہوگا

جس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ اس صنف ادب میں بھی نگار کی خدمات کتنی عظیم الشان ہیں، افسانوں کا اتنا بہتر انتخاب آپ کو شاید ہی کہیں اور نظر آئے۔ ضخامت تقریباً ۲۰۰ صفحات۔ خریداران نگار سے اسکی زاید قیمت نہ لی جائے گی لیکن غیر خریداران کے لئے دو روپیہ ہوگی۔

(مینیجر نگار)

سالانہ چندہ: ہندوستان کے لئے چھ روپیہ

نگار

بیرونِ ہند کے لئے بارہ روپیہ

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۵۴	اگست سنہ ۴۸ء	شمار ۲

ملاحظات

ہندوستان و پاکستان کی سیاسی مشکلات

اس وقت ہندوستان کے سیاسی مستقبل کے متعلق تین سوال سامنے آتے ہیں۔ (۱) آیا وہ اپنے آپ کو انگلو امریکن بلاک میں شامل کرے گا (۲) یا روس کے زیر اثر آنا پسند کرے گا (۳) یا وہ ان دونوں میں سے کسی کے ساتھ شامل نہ ہو کر بالکل غیر جانبدار رہیگا۔ اس وقت ان سوالات پر کافی غور و خوض ہو رہا ہے۔

کشمیر کے مسئلہ میں حکومت ہند کا متحدہ اقوام کو بیچ میں ڈالنا، اس امر کا بین ثبوت ہے کہ وہ دنیا کے دوسرے ملکوں سے کٹ کر بالکل علٰحدہ رہنا تو پسند نہیں کرتا اور نہ اس زمانہ میں جبکہ انسان کے تمدنی تعلقات نے بین الاقوامی صورت اختیار کر لی ہے، ایسا چاہنا ممکن ہے، لیکن اس خواہش کے باوجود یہ سوال بدستور قایم رہتا ہے کہ بین الاقوامی مسایل میں وہ امریکہ اور روس میں سے کس کے ساتھ اپنی قسمت کو وابستہ کرنا پسند کرے گا۔ اس سلسلہ میں یہ کہنا کہ کیوں نہ ہندوستان ان دونوں کے ساتھ یکساں دوستانہ تعلقات قایم رکھے اور کیوں نہ ان دونوں بلاکوں میں سے کسی ایک بلاک میں شامل ہوئے بغیر وہ اپنی ہستی کو برقرار رکھے، بہت مشکل ہے کیونکہ روس اور انگلو امریکن بلاک کے درمیان کشیدگی روز بروز بڑھتی ہی جا رہی ہے اور ماہرین سیاست کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ آج نہیں تو کل ان دونوں کا ایک دوسرے کے خلاف تلوار کھینچکر سامنے آجانا ضروری ہے اور اگر ایسا ہوا تو پھر ہندوستان کو ان دونوں سے علٰحدہ رہکر اپنی موجودہ غیر جانبدارانہ پوزیشن قایم رکھنا آسان نہ ہوگا۔

حصولِ آزادی کے بعد اس وقت تک جتنے بیانات ہمارے ملک کے اکابر کی طرف سے شایع ہوئے ہیں ان سے یہی پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان اپنے آپ کو کسی بلاک سے وابستہ کرنا پسند نہیں کرتا اور وہ اپنی قسمت کا فیصلہ خود اپنے ہاتھ میں رکھے گا۔ چنانچہ کانسٹی ٹوئنٹ اسمبلی میں قومی جھنڈا پیش کرتے ہوئے پنڈت نہرو نے اپنی پالیسی کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا کہ "ہندوستان کا جھنڈا دنیا کے جس گوشہ میں بھی جائے گا، صرف ایک ہی پیغام کا حامل ہوگا اور وہ یہ کہ دنیا کی ساری قومیں آزاد ہیں اور

ہندوستان ہر اس قوم کا حامی اور دوست رہے گا جو آزاد رہنا یا آزادی حاصل کرنا چاہتی ہے"۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ظاہر کیا تھا کہ "ہندوستان ہر ملک کا دوست بنکر رہنا چاہتا ہے"۔ ہم کو پنڈت نہرو کے اس بیان میں تضاد نظر آتا ہے اور تاوقتیکہ آخری فقرہ کی مزید صراحت نہ کی جائے، ہندوستان کی آیندہ سیاسی پالیسی واضح نہیں ہوتی۔

پنڈت نہرو کہتے ہیں کہ "وہ ہر اس قوم کے حامی اور دوست رہیں گے جو آزاد رہنا یا آزادی حاصل کرنا چاہتی ہے" لیکن اس کا لازمی منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر کوئی قوم غلام رہنا پسند کرتی ہے یا کوئی ملک اپنی رعایا کو آزادی دینا نہیں چاہتا تو وہ اس سے رابطۂ اتحاد و دوستی قائم رکھنا پسند نہ کریں گے، اس لئے ان کے بیان کا آخری فقرہ کہ "ہندوستان ہر ملک و قوم کا دوست بنکر رہنا چاہتا ہے" غلط ہو جاتا ہے اور اصولاً اس کو غلط ہونا چاہئے کیونکہ سب کو خوش رکھنے کی کوشش میں انسان کسی کو بھی خوش نہیں رکھ سکتا اور پنڈت نہرو کا یہ اعلان کہ وہ دنیا کی تمام حکومتوں سے دوستانہ تعلقات رکھیں گے عملاً ناممکن ہے۔

اس وقت کی سیاسی دنیا میں غیر جانبداری کا کوئی مفہوم باقی نہیں رہا اور نہ دوستی و دشمنی کے درمیان کوئی صورت ایسی ہے جس کو اختیار کیا جا سکے۔ اور اگر کسی ملک نے اس کی کوشش کی بھی تو وہ کامیاب نہ ہوگا اور اسکو اپنی غیر جانبداری مجبوراً ختم کرنا پڑے گی۔

اس وقت دنیا کے بین الاقوامی تعلقات دو قسم کے ہیں، ایک وہ جن کی بنیاد جلب منفعت پر قایم ہے اور دوسرے وہ جو صرف دفع ضرر سے تعلق رکھتے ہیں۔ یعنی ہم یا تو ان تعلقات کی بنا پر کسی ملک سے کوئی فایدہ اُٹھانا چاہتے ہیں یا یہ چاہتے ہیں کہ ہم کو اس سے کوئی نقصان نہ پہونچے لیکن اگر کوئی ایسا وقت آجائے کہ ہم کو ان دونوں میں سے صرف ایک پہلو کے اختیار کرنے پر مجبور ہوں تو یقیناً ہم اس ملک کا ساتھ دیں گے جس سے ہم کو حصول مفاد کی توقع ہے اور دوسرے ملک کو جس کی طرف سے ضرر پہونچنے کا اندیشہ ہے چھوڑ دیں گے اور چونکہ اس وقت کی سیاسی اصطلاح میں ترک تعلق کے معنے مخالفت و دشمنی کے ہیں اس لئے ہمارا یہ دعویٰ کہ ہم دنیا کے تمام ملکوں کے دوست بنکر رہنا چاہتے ہیں، غلط ہو جائے گا۔

اب آیئے اصول و نظریہ سے ہٹ کر موجودہ حالات پر اس کو منطبق کر کے دیکھیں۔ جیسا کہ ہم ابھی ظاہر کر چکے ہیں اس وقت دنیا دو بلاک میں تقسیم ہے، ایک طرف امریکہ و برطانیہ ہے، دوسری طرف روس اور ان دونوں کے اغراض و مقاصد ایک دوسرے کے بالکل ضد ہیں۔ اشتراکیت کا مقصود سرمایہ داری، ملوکیت و آمریت کی مخالفت ہے اور وہ انفرادی یا طبقاتی دولت و ملکیت کو ختم کر کے قومی دولت و ملکیت میں تبدیل کرنا چاہتی ہے، برخلاف اس کے برطانیہ و امریکہ طبقاتی سرمایہ داری کے حامی ہیں اور ان کی پالیسی دورِ ملوکیت سے صرف اسی حد تک مختلف ہے کہ بجائے شخص واحد (یعنی بادشاہ یا فرمانروا) کے ملک کے اقتصادیات کو وہ سرمایہ دار جماعت کے ہاتھ میں رکھ کر اسی کو حکمراں رکھنا چاہتے ہیں۔ گویا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ روس عوام کی حکومت کا حامی ہے اور امریکن بلاک سرمایہ داروں کی حکومت کا۔ پھر اگر جنگ سے

قبل ہی ہندوستان آزاد ہو جاتا تو اس کو ان دونوں بلاکوں میں سے کسی ایک کے اختیار کرنے میں غالباً زیادہ دشواری نہ ہوتی، لیکن اب کہ اشتراکیت ایک طرف تمام وسط یورپ میں اپنے قدم جما چکی ہے اور فرانس و اٹلی تک اس کے اثرات پہونچ چکے ہیں، دوسری طرف خود ایشیا اور ہندوستان میں بھی عوام کے احساس میں غیر معمولی بیداری پیدا ہو چکی ہے اور مزدور طبقہ کو یقین ہو چلا ہے کہ وہ اپنی متحدہ قوت سے بڑی سی بڑی حکومت کی بنیادیں متزلزل کر سکتے ہیں، ہندوستان کے لئے یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں کہ وہ اپنے آپ کو کس بلاک سے متعلق رکھے۔

اب اس کا دوسرا پہلو ملاحظہ کیجئے:۔ جب تک ہندوستان، برطانوی کامن ویلتھ سے علٰحدگی کا اعلان نہ کرے، اس کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ برطانیہ کا ساتھ دے، اور برطانیہ کو اپنے ساتھ رکھے، لیکن یہ تعلق صرف اسی وقت تک قائم رہ سکتا ہے جب تک ہندوستان، برطانوی اغراض و مقاصد کے پورا ہونے میں حایل نہیں ہوتا اور اشتراکیت کی تحریک سے اپنا دامن بچائے ہوئے ہے۔ پھر غور کیجئے کہ ہندوستان کس حد تک اس میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ حکومت ہند کی آیندہ پالیسی کا جو خاکہ پیش کیا گیا ہے، خواہ وہ کتنی ہی زبردست جمہوریت کا آئینہ دار کیوں نہ ہو، لیکن فی الحال حکومت ہند یقیناً سرمایہ داروں کے سہارے پر چل رہی ہے، اور شاید وہ اسے دفعتاً ختم کرنے میں کامیاب بھی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ملک کی صنعت کو سرمایہ داروں کے ہاتھ سے لے کر قومی ملکیت قرار دینا آسان بات نہیں۔ صنعتی اداروں کے لئے بڑے تجربہ اور بڑی مہارت کی ضرورت ہے جو حکومت کو حاصل نہیں ہیں اور نہ اس وقت تک حاصل ہو سکتے ہیں، جب تک کافی نقصان نہ اٹھایا جائے، چنانچہ برطانیہ میں بھی یہ تجربہ ناکامیاب ثابت ہو رہا ہے اور ماہرین فن کے دست کش ہو جانے سے (جو سرمایہ داروں کے زیر اثر ہیں) تمام صنعتی اداروں کا نظام درہم برہم ہو گیا ہے۔ بہرحال مصلحت کا اقتضاء تو یہی ہے کہ ہندوستان فی الحال برطانوی کامن ویلتھ میں شامل رہے اور سرمایہ داری کو بھی قایم رکھے، لیکن ملک کے اندر جو حالات رونما ہو رہے ہیں، وہ مشکل ہی سے زیادہ عرصہ تک اس کو گوارا کر سکتے ہیں۔ طبقۂ عمال کے روز افزوں مطالبات، اشیاء کی غیر معمولی گرانی، طبقۂ حکام کی ناتجربہ کاری، تنگ نظری و خود غرضی، مذہبی و طبقاتی اختلاف و کشاکش، یہ تمام باتیں ایسی ہیں جنھوں نے ہندوستانی حکومت کو بڑی مشکلات میں مبتلا کر رکھا ہے اور وہ اسوقت ایک ایسی چٹان پر کھڑی ہے جس پر قدم جمنا بھی مشکل ہے اور جس سے ہٹ کر سیلاب سے بچنا بھی محال ہے۔ وہ اگر برطانوی بلاک میں شامل رہ کر اس کی پالیسی پر چلتا ہے تو قطع نظر اس سے کہ یہ خود حکومت کے ضمیر کے منافی ہے، ملک کا بڑھتا ہوا میلان اشتراکیت زیادہ عرصہ تک اس کی اجازت نہ دیگا، اور اگر اس رجحان کا مقابلہ کیا گیا تو ہندوستان کا بھی وہی حشر ہوگا جو اس وقت چین کا ہمارے سامنے ہے۔ پھر اگر وہ اپنے آپ کو روس کے دامن سے وابستہ کرتا ہے تو برطانیہ و امریکہ اس کے مخالف ہو جائیں گے اور پاکستان کو مرکز بنا کر پاکستان ایران و افغانستان کا پورا بلاک روس کے مقابلہ کے لئے طیار کریں گے اور اگر روس و امریکہ کے درمیان جنگ ہو گئی جسکا قوی اندیشہ ہے تو ہندوستان کو اس سے سخت نقصان پہونچے گا، کیونکہ پاکستانی بلاک کی وجہ سے نہ روس، ہندوستان کی

مدد کرسکے گا اور نہ ہندوستان، روس کی اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ یا تو ملک خود خانہ جنگی سے تباہ ہوجائے گا یا امریکہ و برطانیہ کے بمبار جہاز اسے برباد کردیں گے۔ کیونکہ ہندوستان شاید صدیوں تک اس قابل نہیں ہوسکتا کہ وہ امریکہ کے جوہری بم کا جواب دے سکے۔

تاہم بہ حالات موجودہ اسکے لئے یقیناً کوئی چارۂ کار اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ امریکہ و برطانیہ کی دوستی کو ہاتھ سے نہ دے، لیکن چونکہ ان کی دوستی بھی مضرت سے خالی نہیں ہے اور بالکل ممکن ہے کہ وہ جلد ہی اس کے ختم کرنے پر مجبور کردیجائے، اس لئے محفوظ ترین طریقہ صرف یہی ہوسکتا ہے کہ وہ ایشیا کی حکومتوں کا ایک بلاک علٰحدہ قائم کرے اور اس بلاک میں چونکہ سب سے زیادہ اہمیت پاکستان کو حاصل ہے، اس لئے وہ کوشش کرے کہ پاکستان، امریکہ و برطانیہ کے ہاتھ کا کھلونا نہ بن جائے۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ ہندوستان کے مقابلہ میں پاکستان بہت کمزور و غریب ملک ہے، لیکن اس کی یہ کمزوری و غریبی ہی بہت خطرناک ہے۔ کیونکہ ہندوستان میں بڑے بڑے تجارتی شہر ہیں، صنعتی ادارے ہیں، معدنیں ہیں، فوجی مراکز ہیں، دولتمند آبادیاں ہیں، متعدد بندرگاہ ہیں، اور ان کے مقابلہ میں پاکستان کے پاس گویا کچھ بھی نہیں، اسلئے پاکستان کے سامنے صرف ایک ہی چیز ہے، جرح و اقدام، لیکن ہندوستان کے سامنے اہم ترین سوال مدافعت کا ہے۔ پھر ایک ویرانہ کا ویران تر ہوجانا تو کوئی ایسی بات نہیں، لیکن ایک پھلے پھولے باغ کے اُجڑ جانے کا اندیشہ بڑی بات ہے۔

ہرچند یہ بالکل درست ہے کہ پاکستان، ہندوستان کے مقابلہ میں کامیاب نہیں ہوسکتا، لیکن اگر اُسکی ناکامی کا نتیجہ یہ ہو کہ وہ پھر ہندوستان میں شامل ہوجائے، تو اس میں شک نہیں ہندوستان کے لئے بڑی بات ہے، لیکن حکومت ہند اچھی طرح جانتی ہے کہ اگر خدانا کردہ ایسا وقت آیا تو برطانیہ و امریکہ خاموش بیٹھے نہ رہیں گے اور وہ پاکستان کے وجود کو اس وقت تک کبھی نہ مٹنے دیں گے جب تک روس کا وجود باقی ہے، کیونکہ ایشیا میں اگر کسی محاذ سے روس کا کامیاب مقابلہ کیا جاسکتا ہے تو وہ پاکستان ہی ہے اور سچ پوچھئے تو پاکستان کی تخلیق کا باعث یہی خیال تھا، اور بساط سیاست پر برطانوی شاطروں کی یہ وہ چال تھی جسے وہ بہت پہلے سے سوچے ہوئے تھے۔ الغرض ہندوستان اس وقت خطروں سے گھرا ہوا ہے اور ہرچند اس کی نجات اسی میں ہے کہ پاکستان و ہندوستان کے تعلق خوشگوار رہیں، لیکن بدقسمتی سے ان کے باہمی تعلقات میں کشیدگی بڑھتی ہی جارہی ہے اور اندیشہ ہے کہ یہ کشیدگی کوئی ایسی صورت نہ اختیار کرلے جس کا تصور ہی دل ہلا دینے والا ہے۔

ہندوستان و پاکستان کی طرف سے ایک دوسرے کے خلاف جو الزامات قایم کئے جاتے ہیں، وہ غلط ہوں یا صحیح لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ اگر ان میں سے کوئی ایک فریق جذبۂ انتقام سے ہٹ کر محض ایثار و رواداری سے کام لے تو چند دن میں یہ تناؤ دور ہوسکتا ہے، لیکن افسوس ہے کہ اس کے آثار کسی طرف سے نظر نہیں آتے، اور ہندوستان و پاکستان کے

اخبارات جن کا مقصد ہی اختلاف پیدا کرنا اور بڑھانا ہے۔ اپنی تحریروں سے اس آگ کو اور بھڑکاتے رہتے ہیں۔

یہاں تک تو ایک ہندوستانی باشندہ ہونے کی حیثیت سے، ہمارا خطاب ہندوستان سے تھا، لیکن مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم غالباً پاکستان سے بھی کچھ کہنے کا حق رکھتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ اگر پاکستان کو واقعی ترقی کرنا ہے تو اس کا صحیح راستہ یہ نہیں ہے کہ وہ مغربی ممالک کی امداد پر بھروسہ کر کے ہندوستان سے بگاڑ کرلے، کیونکہ برطانیہ و امریکہ کبھی کسی کے دوست نہیں ہو سکتے اور وہ پاکستان کی صرف اسی حد اور وقت تک امداد کریں گے جب تک اُن کے اغراض پورے نہیں ہوتے اور جس دن ان کا مقصود پورا ہو گیا وہ فوراً ہاتھ کھینچ لیں گے اور پاکستان کی آزادی و ترقی کا خواب، خوابِ پریشاں ہو کر رہ جائے گا۔ پاکستان، ہندوستان ہی کا ایک ٹکڑا ہے اور نہ صرف اپنی صنعتی ترقی، تجارتی فلاح اور اقتصادی بہبود کے لحاظ سے بلکہ اس حیثیت سے بھی کہ چار کروڑ مسلمان یہاں بستے ہیں، وہ مجبور ہے کہ ہندوستان سے دوستانہ تعلقات قایم رکھے اور یہ وہ حقیقت ہے جس کو آج نہیں تو کل اسے تسلیم کرنا پڑے گا، کیونکہ اگر پاکستان ختم ہو گیا تو ہندوستان کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہونچ سکتا لیکن اگر باہمی مخالفت سے ہندوستان کو کوئی نقصان پہونچ گیا تو پاکستان بھی ختم ہے۔

علاوہ اس کے پاکستان کو یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ مسلمان کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ظاہر و باطن یکساں ہوتا ہے اس کے قول و عمل میں اختلاف نہیں ہوتا۔ اس لئے اگر پاکستان کا یہ اعلان کہ وہ ہندوستان کے ساتھ دوستی کے تعلقات رکھنا چاہتا ہے، درست ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ اپنے عمل سے بھی اس کو ثابت کرے۔

کشمیر کے مسئلہ میں اس نے بارہا ظاہر کیا ہے کہ سرحدی حملہ آوروں سے اسے کوئی تعلق نہیں ہے، اس لئے اگر تحقیق کے بعد ہندوستانی حکومت کا یہ الزام کہ پاکستان درپردہ حملہ آوروں کی مدد کر رہا ہے، صحیح ثابت ہوا، تو یہ نہ صرف پاکستان بلکہ تمام مسلم جماعت کے لئے بڑے شرم کی بات ہوگی۔ اگر پاکستان واقعی ہندوستان سے لڑنا چاہتا ہے تو اسے کھلم کھلا تلوار کھینچ کر میدان میں آجانا چاہئے، اور اگر وہ ہندوستان کا دوست رہنا چاہتا ہے تو اسے اپنے اس عہد کا احترام کرنا چاہئے اور اگر ہندوستانی حکومت کی طرف سے اسے کچھ شکایتیں ہوں بھی تو انھیں دوستی کے طریقہ سے پیش کرنا چاہئے۔

حیدرآباد ہندوستان و حیدرآباد کے تعلقات نے بہت نازک صورت اختیار کر لی ہے اور اگر وہ خبریں جو رضاکاروں کی غارتگری اور امن شکنی کے متعلق آرہی ہیں صحیح ہیں، تو ہمیں حیدرآباد کے ارباب حکومت کے تساہل و تجاہل پر سخت افسوس ہے اور اگر غلط ہیں تو اس سے زیادہ افسوس ہے کیونکہ ان خبروں کی تردید بھی اُن سے نہیں کی جاتی — بہرحال اس کشمکش کا نتیجہ جو کچھ ہو، ہمیں امید ہے کہ ہندوستانی حکومت اس کو ہندو مسلم سوال نہ بننے دے گی، تاکہ دکن کی یہ آگ شمال کی طرف نہ بڑھے۔ ورنہ خود حکومت کے لئے مشکل ہو جائے گا کہ وہ پوری یکسوئی کے ساتھ حیدرآباد کے باب میں کوئی قدم اُٹھائے۔

مرزا داغ اور مُنّی بائی

حضرتِ داغ کی طفلی شاہی قلعہ میں گزری اُن کے والد نواب شمس الدین خاں رئیس لوہارو نے جب انتقال فرمایا تو داغ کی عمر چھ یا سات برس کی تھی، والدہ نے شاہ ظفر کے ولی عہد فتح الملک مرزا فخرو سے عقد کر لیا، داغ کی تعلیم و تربیت شاہزادوں کے ساتھ قلعہ میں ہونے لگی، ۶-۷ برس کی عمر سے اٹھارہ برس کی عمر تک جس کو آغازِ شباب کہہ سکتے ہیں داغ نے قلعہ کی رنگ رلیوں کو آنکھ سے دیکھا، اسی کا اثر کہہ لیجئے کہ ان کی تمام عمر راگ رنگ، عشق و محبت کی کیفیتوں سے مانوس رہی شاہزادہ فتح الملک مرزا فخرو سے داغ کو جو نسبت تھی اس کا اندازہ اس سے فرمائیے کہ ۱۲۶۷ھ میں جب مولوی کریم الدین کے مشہور مشاعرے میں ولی عہد بہادر شریک ہوئے تو ہوادار میں ان کے ہم رکاب داغ تھے، جب ہوادار سے اُترے تو داغ کے ہاتھ میں ہاتھ تھا، ۱۲۷۲ھ میں ولی عہد بہادر نے ہیضے سے انتقال کیا اس سے دس گیارہ ماہ بعد ہی غدر کا ہنگامہ شروع ہو گیا داغ اُس وقت ۲۵ سال کے تھے، غدر کے بعد بہت پریشان زندگی گزرنے لگی، دہلی چھوڑ دی اور رام پور پہونچے ــــ شباب پورے جوش پر تھا، بہارستان رام پور نے چار چاند لگا دئے۔ وہاں وہ نواب یوسف علی خاں کے مصاحبین میں شمار ہونے لگے، یہ وہ زمانہ تھا کہ پرانی حکومت کے جو آثار باقی رہ گئے تھے وہ اگر بالکل نہیں تو کسی حد تک عیش و نشاط اور راگ رنگ کے ضرور کہے جا سکتے تھے، وہی سامانِ عیش و نشاط اور نغمہ و چنگ جو کسی زمانہ میں فنی ترقیات کے پیشِ نظر لازمۂ تختِ تاج تھا وہ اب شغل و تفریح کے سوا کچھ بھی نہیں رہے تھے۔ اُس وقت کون سا متمول اور صاحبِ حیثیت ایسا تھا جس نے اس چیز کو اپنی معاشرت اور روزمرہ زندگی کا جزو قرار نہیں دے لیا تھا، کون صاحبِ حیثیت ایسا تھا جس نے اس چیز کو اپنی معاشرت اور روزمرہ زندگی کا جزو قرار نہیں دے لیا تھا، کون صاحبِ حوصلہ تھا جس کے یہاں دو ایک طوائفیں، دو چار گویئے اور دس پانچ صاحبانِ فن کی موجودگی نہ ہو۔ حضرتِ داغ جن کی عمر زمانۂ نمو سے شباب تک ایسے ہی پرکیف و زندہ ماحول میں گزری تھی کس طرح اس رواجِ عام سے علٰحدہ رہ سکتے تھے۔ اُن کی بھی ایک پرائیویٹ لائف تھی اور وہ بھی دل لگانے اور دل بہلانے میں کسی سے کم نہ تھے۔

میرے سامنے اس وقت ایک قلمی مسودہ ہے، حضرتِ داغ کے شاگردوں میں حضرت احسن مارہروی اور مولوی سید افتخار عالم صاحب مارہروی کا کچھ زمانہ داغ کی صحبت میں گزرا تھا، یہ لوگ نہ صرف یہ کہ روزمرہ کے حاضر باشوں میں تھے بلکہ بعض مخصوص خدمات بھی ان کو تفویض تھیں، مثلاً شاگردوں اور احباب کے خطوط کو پڑھ کر سنانا اور ان کے جوابات لکھنا، شاگردوں کی غزلوں

کو سنانا اور اُستاد سے ان پر اصلاح لینا انھیں لوگوں کے سپرد تھا۔ ان دونوں حضرات نے داغ کی ہم نشینی سے فایدہ بھی اُٹھایا، مولانا احسن مارہروی مرحوم کی مرتبہ "فصیح اللغات" اسی زمانہ کی یادگار ہے، مولوی افتخارِ عالم صاحب نے ایک بالکل نئی چیز اس زمانہ میں ترتیب دے ڈالی۔ وہ چپکے چپکے ایک روزنامچہ لکھتے رہے۔ دن بھر داغ کی صحبت میں جو گزرتا اور آنکھ سے دیکھتے شام کو قیام گاہ آکر وہ سب قلم بند کر لیتے اس روزنامچہ میں انھوں نے ایسے کل واقعات من وعن درج کر دئے ہیں جو ہندوستان کے اس مشہور شاعر کی زندگی کے ہر رخ کو بے حجاب کر دیتے ہیں، اس مسودے میں ایسے نوٹ بھی ہیں جو داغ کے اخلاق و کردار پر روشنی ڈالتے ہیں، ایسی یادداشتیں بھی ہیں جو داغ کے علم و عمل اور مذہب و ایمان کی وضاحت کرتی ہیں، ایسے واقعات بھی اس مسودے میں موجود ہیں جو حضرتِ داغ کی جنسی زندگی کو بے نقاب کر دیتے ہیں، بہرحال یہ روزنامچہ بڑی جاندار، بڑی پُر لطف اور بڑی قیمتی یادداشتوں پر مشتمل ہے۔ اس مسودہ کی جامعیت کا اندازہ آپ اس سے فرما سکتے ہیں کہ حضرت احسن مارہروی نے داغ کی لائف یعنی "یادگار داغ" مرتب کی تو اسی مسودے کی امداد اُن کے شاملِ حال تھی، رسالہ کلیم دہلی میں جب انھوں نے "داغ و احسن" کے عنوان سے ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا تو بھی یہی مسودہ اُنکے سامنے تھا اور آج میں داغ کی زندگی کے بعض "پسِ پردہ" واقعات پیش کر رہا ہوں تو یہی مسودہ میرے سامنے ہے۔ یہ یادداشتیں اوائل نومبر ۱۹۰۱ء سے شروع ہو کر جولائی ۱۹۰۲ء کو ختم ہو جاتی ہیں۔ لیکن مسودے کی ترتیب یہ واضح کرتی ہے کہ اس کا سلسلہ آگے بھی تھا لیکن افسوس باقی اوراق مسودے سے غائب ہیں بہرحال یہ قیمتی روزنامچہ جس حد تک موجود ہے، خوب ہے۔

مولانا احسن مارہروی مرحوم نے یادگار داغ اور بعض دیگر مضامین میں مرزا داغ کی رنگین مزاجی، راگ رنگ سے دلچسپی اور شاہدانِ بازاری سے ربط و ضبط کا اقرار تو کیا ہے لیکن ضمنی حیثیت سے اور دبی ہوئی زبان میں۔ حالانکہ یہ زندگی داغ کی پوری وضاحت کی محتاج تھی ——— اس احتیاط کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ یہ تو جان گئے کہ مرزا داغ شاہد باز و عیش پسند تھے لیکن یہ کسی نے نہیں جانا کہ ان کی رنگین مزاجی و شاہد بازی میں بھی وضعداری و پاکیزگی کے جوہر شامل تھے۔ درحقیقت اس باب میں حامیانِ داغ کے غیر واضح بیانات سے یہ ہوا کہ داغ اپنی جگہ سے گر گئے اور لوگ انھیں آجتک بوالہوس اور عیاش متصور کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ کوئی نہیں سمجھ سکا کہ داغ کی زندگی اگر نغمۂ عشق سے تہی پایہ ہوتی تو وہ کبھی بلند مرتبہ حاصل نہیں کر سکتے تھے جو ان کو اپنی شاعری کی بنا پر حاصل ہے۔ اسی رنگین مزاجی اور شاہد بازی نے ان کے کلام کو وہ چسکدی ہے کہ آج سنجیدہ سے سنجیدہ فرد بھی داغ کے شعر پر تڑپ اُٹھتا ہے۔

ان تمام باتوں کے اظہار و اعلان کے باوجود مجھے یقین ہے کہ اس ترقی یافتہ زمانہ میں بھی بعض ایسے حامیان داغ ہوں گے جو کسی عنوان یہ پسند نہ فرمائیں گے کہ داغ کی زندگی کے بعض "پسِ پردہ" واقعات منظرِ عام پر لائے جائیں۔ مجھے یقین ہے کہ میں آگے جو کچھ پیش کرنے والا ہوں اس کو پڑھ کر وہ خشمگیں ہوں گے لیکن مجھے کہنا پڑتا ہے کہ جب اُن کی نگاہیں صفحات پر داغ کے مفصل ذیل عریاں اور بے باک اشعار گوارا کر سکتی ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ واقعات بھی ان کے گوش گزار

نہ کردئے جائیں جو ان اشعار سے ہرگز مختلف نہ تھے ملاحظہ ہو:

وہ دوپٹہ کا سرکنا وہ کسی کا کہنا — آنکھیں پھوٹیں جو کوئی سینہ ہمارا دیکھے

کیا کروں داغ وصل میں شکوہ — بات کہنے میں رات جاتی ہے

وہ جو بولیں تو رات جاتی ہے — چپ رہوں میں تو رات جاتی ہے

اچھی[1] بری شبیہہ کو کب دیکھتے ہیں داغ — مٹی کی بھی ملے تو روا ہے شباب میں

قیام رام پور کے زمانہ میں کسی کام سے حضرت داغ کلکتہ تشریف لے گئے وہاں ایک پرکالۂ آتش سے ملاقات ہوئی نام اُس کا منی بائی تھا، داغ اُسے اپنا دل دے بیٹھے، کلکتہ سے پٹنے آئے وہاں شعر و شاعری کی صحبتیں گرم تھیں لیکن داغ کا دل اُچاٹ تھا، ایک مشاعرے میں شریک ہوئے اس مشاعرے کی غزل کا مقطعہ ملاحظہ ہو، کلکتہ کی یاد کس انداز میں کرتے ہیں:

کوئی چھیڑا پڑے تو داغ کلکتہ چلے جائیں — عظیم آباد میں وہ منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

مثنوی "فریاد داغ" اُسی زمانہ کی پیداوار ہے اور خالصتاً منی بائی کے ہجر و فراق کا نتیجہ ہے اُس کے پڑھنے سے داغ کے سوزِ عشق اور ان کی محبت و گرویدگی کے عمق کا پتہ چلتا ہے، منی بائی ایک تعلیم یافتہ طوائف تھی۔ شاعری بھی کرتی تھی - شاعری بھی کرتی تھی۔ حجاب تخلص تھا۔ یہ چیز متنازعہ فیہ ہے کہ آیا وہ فیضِ داغ سے شاعرہ ہوئی یا پہلے سے شعر کہا کرتی تھی۔ جس زمانہ میں داغ اُس سے ملے وہ ایک شخص کی پابند و ملازم تھی، داغ کی پذیرائی نہ ہو سکی اس چیز نے سوزِ عشق پر وہ کام کیا جو آگ پر تیل کا کام کرتا ہے، محبت کی جو چوٹ داغ نے دل پر کھائی تھی، زخم بنی اور بالآخر ناسور ہو گئی حجاب کا خیال سوہانِ روح بن گیا، آفاتِ روزگار نے سوزِ عشق کو اور ہوا دی، رام پور سے دہلی آ گئے، دہلی میں دل نہ لگا تو لاہور، امرت سر، ریاست کشن گڑھ، اجمیر، آگرہ، علی گڑھ اور متھرا کی سیر کو نکل گئے، لیکن گئے لیکن یہ سفر ان کی پریشانیوں میں اضافہ ہی کرتا رہا اور وہ ہمیشہ ان الفاظ میں شکوہ ریز رہے:

حسن کمیاب نغمہ ہے نایاب — شہر در شہر جا کے دیکھ لیا

۱۸۹۸ء میں وہ حیدر آباد پہونچے، چند ماہ رہ کر واپس دہلی آ گئے، دوبارہ امید حیدر آباد لے کر پہونچی، ایک عرصہ کی امیدواری کے بعد آصف جاہ مرحوم کی اُستادی سے مشرف ہوئے ابتداً ساڑھے چار سو تنخواہ مقرر ہوئی جو کچھ عرصہ کے بعد ایک ہزار ہو گئی، منی بائی حجاب کی جو چوٹ دل پر کھائی تھی آسودگی و فراغت نصیب ہوتے ہی اپنے خاکستر سے پھر اُبھری لیکن وہ کلکتہ تھی اور حضرت داغ حیدر آباد۔ کتابت شروع ہوئی اور ایک عرصہ کی کوشش و تگ و دو کے بعد بالآخر ہجراں نصیب داغ، منی بائی حجاب کے حصول میں کامیاب ہوئے۔ باقی داستان اب آپ مولوی افتخار عالم صاحب کی

---

[1] اس مصرعہ میں مجھے کچھ شک ہے۔ یاد سے لکھ رہا ہے۔ دوسرا مصرعہ بے شک ہے۔

زبان سے سنئے:

۱۰ر دسمبر ۱۹۰۱ء

آج مرزا صاحب نے مجھ سے متعدد خطوط لکھوائے، سات آٹھ خط لکھوانے کے بعد بولے کہ ایک خط اور لکھانا تھا لیکن وہ میں خود لکھوں گا، پھر کچھ سوچکر بولے کہ اچھا تم ہی لکھو۔

دشمنِ جانی، سلام شوق

عینِ انتظار میں تمہارا محبت نامہ دستیاب ہوا، کئی بار پڑھا، آنکھوں سے لگایا، چوما اور چھاتی پر دھرا رہا۔ تم لکھتی ہو کہ مجھے بھول جاؤ اور اگر نہ بھولو تو بدل جاؤ۔ یہ کرلوگے جب ہی تمہارے پاس آؤں گی۔ خوب تم کو میں بھول جاؤں ؎

تو بھولنے کی چیز نہیں خوب یاد رکھ نادان[1] کس طرح تجھے دل سے بھلائیں ہم

اچھا تم یہاں آجاؤ، پھر ہم دونوں ایک دوسرے کو بھولنے کی کوشش کریں گے۔ مجھے تمہاری ہر بات منظور ہے، جواب میں لکھو کب آرہی ہو۔

۱۵ر دسمبر ۱۹۰۱ء

آج مرزا صاحب کے ایک شاگرد الہ آباد سے تشریف لائے، وہاں کی ایک طوائف نے اپنی تصویر مرزا کو بھیجی ہے اور تازہ غزلوں کی فرمائش کی ہے، مرزا صاحب نے اُس کے تحفے کے جواب میں مجھ سے خط لکھوایا، ملاحظہ ہو:

"حور کی صورت نور کی مورت، خوش رہو اور ہم سے ملو

تمہارے پیغامبر تشریف لائے۔ بر سبیل تذکرہ تمہاری طرف سے تمہارا ایک ہدیہ پیش کیا یعنی تمہاری تصویر، تصویر نہیں بلکہ تیر، نام پوچھا تو خواہ مخواہ یقین لانا پڑا، بار خدایا ایسی صورت بھی تو نے پیدا کی ہے، سیرت کی تعریف سنی تو صورت سے بڑھ کر خوش آواز، خوش مزاج اور پھر اس پر لکھی پڑھی۔ زمانہ ایسے لوگوں کی جس قدر قدر کرے کم ہے ؎

بت ہی پتھر کا کیوں نہ ہو اے داغ اچھی صورت کو دیکھتا ہوں میں

کیوں جی، تم سے کیوں کر ملیں، تم کو کیوں کر دیکھیں، کیونکر سنیں اور اگر دیکھیں تو پھر کیونکر جئیں، جو عاشق مزاج ازلی ہو خیال کرلو کہ اُس کا کیا حال ہوگا۔ تم سے یہ امید نہیں کہ خواب میں بھی آؤ، ہائے مہجوری اور وائے مہجوری، میں نے سنا ہے کہ مہتاب داغ تمہارے پاس نہیں ہے بطور تحفہ بھیجتا ہوں اگر خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہے تو غنیمت ہے۔ سوئے ادبی

---

[1] یہ شعر لکھانے سے پہلے کچھ دیر مرزا صاحب خاموش رہے، پھر شعر لکھایا، دوسرے دن میری فرمائش پر اس شعر پر غزل کہی اوپر کے شعر کو تھوڑی رد و بدل کے بعد مقطع کر دیا جو یہ ہے ؎

تو بھولنے کی چیز نہیں خوب یاد رکھ ← اے داغ کس طرح تجھے دل سے بھلائیں ہم

کے خیال سے تمہارے نام میں ایک لقطے کا ردوبدل مناسب رہے گا نون کا نقطہ ب کی جگہ اور ب کا نقطہ نون کی جگہ ہونا چاہئے۔ یعنی نبی جان کی بجائے بنی جان ہونا چاہئے"۔ آخر خط میں یہ رباعی فی البدیہہ فرما کر لکھوائی:

کیا بات ہے کیا گھات ہے اللہ رے شریر — سوجھی ہے نئی طرح کی تجھ کو تدبیر
کب دیکھنے والوں پہ کھلا دل کا حال — کچھوائی ہے کیا سینہ چھپا کر تصویر

۲۵ر دسمبر ۱۹۰۱ء

منی بائی حجاب جن پر مرزا صاحب کلکتہ میں عاشق ہوئے تھے اور جن کے مرزا صاحب طلب گار تھے حیدرآباد آنے کو آمادہ ہوگئیں۔ چند برس سے حجاب نے کوئی "شخص" ـــــ "صاحب" سے نکاح کر لیا تھا، خدا خدا کر کے اُن سے طلاق لی، مرزا صاحب کو خط لکھا، سُن کر خوش ہوگئے، آج بعد مغرب حسب معمول ایک طرف صدر میں مرزا صاحب بیٹھے تھے، چند اور احباب بھی تشریف فرما تھے، فرمانے لگے، کیوں جی منی بائی کو عدت میں بٹھانا پڑے گا، لوگوں نے جواب دیا کیوں نہیں فرمانے لگے کہ دس برس میں بھروسے سے کچھ نہ ہوا تو کیا عین طلاق کے زمانہ میں کچھ ہو سکا ہوگا بھائی مجھ سے تو یہ نہ ہوگا کہ میں اُن کو عدت میں بٹھاؤں ویسے وہ میرے نزدیک ۲۲ برس سے عدت میں بیٹھی ہوئی ہیں۔

۵ر جنوری ۱۹۰۲ء

آج ایک بڈھی کھوسٹ طوائف جو عرصہ سے حیدرآباد میں وارد تھی مرزا صاحب کے سلام کو آئی اُس کا مکان پوچھا، باتوں باتوں میں کہنے لگی کہ آپ مجھے بھول گئے، برسوں آپ سے تعلق رہا۔ مرزا صاحب کہنے لگے کہ قسم کھاتا ہوں کہ آج سے پہلے تیری صورت بھی دیکھی ہو اور تو کہتی ہے کہ میرا تجھ سے تعلق رہا۔ بڑی دیر تک مرزا صاحب اُس طوائف سے ہنسی مذاق کرتے رہے۔

۸ر جنوری ۱۹۰۲ء

آج منی بائی حجاب کا ایک خط آیا اُسے پڑھ کر مرزا صاحب بولے کہ حجاب خط میں یہ عہد فرما رہی ہیں کہ جب تک نکاح نہیں کرلوں گی تمہارے سامنے نہیں آؤں گی۔ میں نے یہ تمام جھگڑے اس لئے نہیں کئے ہیں کہ شرعی باتوں سے قطع نظر کرلوں، تم اس بھروسے میں نہ رہنا کہ میں تمہارے سامنے آجاؤں، میرے لئے علٰحدہ مکان لینا، اُسی میں اُتروں گی اور جب تک قاضی نکاح نہیں پڑھائیں گے اس وقت تک تم میری صورت کے دیکھنے کے مجاز نہ ہوگے، اتنا کہہ کر مرزا صاحب بولے کہ بہت اچھا ایسی دھجیاں اڑائی ہوں کہ وہ بھی خوب یاد کریں، بے تکلف حاضرین کی طرف مخاطب ہو کر بولے کہ دیکھو بھائی جب وہ تشریف لائیں تو مجھ کو ایسی جگہ چھپانا کہ وہ اگر ڈھونڈیں بھی تو نہ پائیں مگر حجاب ایک چلتی ہوئی عورت ہے مجھے تو یہ ڈر معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دوسری

عورت اس پردے میں مجھ سے نکاح نہ پڑھوالے، انھوں نے جب مجھ سے یہ شرط کی ہے کہ جب تک نکاح نہ ہوگا اُسوقت تک میں سامنے نہیں آؤں گی تو میں کیسے جان سکتا ہوں کہ میری بیوی منی بائی حجاب ہی بنیں گی اس لئے مناسب یہ ہے کہ جب تک وہ یہاں حیدر آباد میں کھچوایا ہوا فوٹو نہیں پیش کریں گی اُس وقت تک نکاح نہیں ہوسکتا۔

۲۲ر جنوری ۱۹۰۲ء

منی بائی حجاب آج چار روز ہوئے کلکتہ سے تشریف لے آئی ہیں، ایک طوائف کی ایسی دُنیا بدلی ہے کہ کوئی وقت وظیفے سے خالی نہیں ہے، تحقیق سے معلوم ہوا کہ صوم وصلوٰۃ کی پابندی ۵-۶ برس سے اُن کی گھٹی میں پڑگئی ہے، ہر سال رجب سے رمضان تک مسلسل روزے رکھتی ہیں، اُن کی اس حالت کو دیکھ کر مرزا صاحب فرمارہے تھے کہ دو چار برس میں "ولیہ" ہوجائینگی

منی بائی حجاب جب حیدر آباد وارد ہوئیں تو سب سے پہلی چیز جو تحفتاً ان کو پیش کی گئی وہ ایک جا نماز اور تسبیح تھی۔ جس روز سے منی بائی حجاب تشریف لائی ہیں مرزا صاحب کی زبان پر اُن کے زہد کا ذکر ہے، آج فرمارہے تھے کہ میرے گھر میں فرشتن آئی ہیں۔ آسمان پر ایک شور مچا ہوا ہے، اللہ میاں کے پاس فرشتے فریاد لے کر گئے کہ آدمیوں میں اے خدا تو نے عبادت کی ایسی طاقت کب دی تھی پھر کیا وجہ ہے کہ داغ کے گھر میں ایک عورت ایسی آئی ہوئی ہے جو ہم سے بھی سبقت لے گئی ہے، مرزا صاحب اس ضمن میں یہ بھی بولے کہ میں نے بی حجاب سے کہدیا ہے کہ نماز کے سوا جب تک تمھارے وظیفے وظائف نہیں چھوٹیں گے اس وقت تک تم انسان نہیں بن سکتیں اور جب تک انسان نہیں بن سکتیں اُس وقت تک میرے کام کی نہیں۔ بہر حال تم یاد رکھو رفتہ رفتہ تمھارے سب وظیفے چھڑادوں گا اور تم کو خالی نماز پر اکتفا کرنا ہوگا۔

۲۴ر جنوری ۱۹۰۲ء

ڈاکٹر احمد علی حیدر آباد میں ایک فوجی ڈاکٹر ہیں، آج شام کو ہم بہت سے لوگ مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر تھے، اتنے میں ڈاکٹر صاحب تشریف لائے۔ مرزا صاحب اُن سے بولے کہ حضرت ہمارے یہاں فرشتن آئی ہوئی ہیں، مرزا صاحب کی ایک ماما کسی کام سے اسی وقت باہر آئی ڈاکٹر موصوف نے کہا کہ کیا یہی فرشتن ہیں، مرزا ہنس کر بولے کہ نہیں یہ تو چڑیل ہے

اس کے بعد منی بائی حجاب کا ذکر ہونے لگا مرزا صاحب نے بتایا کہ وہ دو تین برس کا مل اجمیر رہی ہیں، وہاں چلا کشی بھی کی تھی کوئی مراد دل میں ہوگی، ایسی قلب ماہیت ہوئی کہ ایک زمانہ وہ تھا کہ نماز روزہ کیسا کبھی تھیں اور اب یہ حال ہے کہ ہر وقت نماز ہے اور ہر وقت تسبیح۔ مصلیٰ پر بیٹھی ہوئی ہیں کون سی نماز ایسی ہے جو نہ پڑھی جاتی ہو۔

ایک بے تکلف نے مرزا سے پوچھا کہ حضرت کیا آپ اُن سے شادی کریں گے، انھوں نے جواب دیا کہ بھائی مجھے کچھ نہیں معلوم۔ ۲۲ برس کے بعد تو یہ دن نصیب ہوا ہے، میں تو راضی ہوں مگر وہ ابھی راضی نہیں ہیں، بہر حال ہے

راہ پر اُن کو لگا لائے تو ہیں باتوں میں اور کھُل جائیں گے دو ایک ملاقاتوں میں

اسی صحبت میں ایک بے تکلف نے کہا کہ حضرت آپ کی عمر ۷۰ برس کی ہو چکی اب آپ کس برتے پر عقد کا ارادہ رکھتے ہیں اور ایسے نکاح سے کیا فایدہ، مرزا صاحب نے جواب میں فی البدیہہ یہ شعر پڑھا ؎

جناب داغ اب سنبھلیں گے کیا خاک کہ وہ بگڑے ہوئے ہیں عمر بھر کے

مرزا صاحب نے فرمایا کہ مجھے تمام عمر میں پانچ عشق ہوئے ہیں جن میں سے دو اب تک میرے رگ و ریشے میں سمائے ہوئے ہیں۔ ایک بی منی بائی حجاب کا عشق اور دوسرا عشق خواجہ معین الدین چشتی کا۔

۲۵ر جنوری ۱۹۰۲ء

جب سے منی بائی حجاب تشریف لائی ہیں مرزا صاحب اپنے مردانے مکان میں کم بیٹھتے ہیں۔ دو تین گھنٹے کے سوا سارا وقت حجاب کے پاس گزرتا ہے، مرزا صاحب کی یہ ادا اُن کے احباب کو بہت ناگوار ہے، اسی وجہ سے اُنکے مخلص دوستوں کی آمد و رفت کم ہو گئی ہے، آج بعد مغرب مرزا صاحب نے اپنے ایک دوست نواب سید حسین علی خاں کو جب کہ وہ دو روز سے تشریف نہیں لائے تھے مجھ سے یہ خط لکھوایا:

"نواب صاحب بہادر۔ کہتے ہیں کہ کل صبح پتنگوں کے پیچ ہیں، بغیر نواب صاحب کی تشریف آوری کے کچھ نہیں ہو سکتا، مجھ کو خبر نہیں تھی کہ پیچ تو وہاں لڑیں گے اور دلوں میں پیچ مجھ سے پڑیں گے۔ مرد خدا یہ کیا بات ہے، آپ نے یک لخت ملاقات کم کر کے کیوں ترک کر دی میں نے کوئی بات بغیر آپ کے مشورہ کے نہیں کی، مصلحت وقت نہیں چھوڑی جاتی آپ کو حسب معمول روز آنا چاہیئے، ماحضر یہیں تناول فرمانا چاہیئے اور اگر یہاں کھانا کھانا گوارا نہیں تو بہتر نہ کھایئے۔ مجھ کو غم بھی نہ کہلایئے۔ آیئے آیئے تشریف لایئے۔

۲ر فروری ۱۹۰۲ء

کلکتہ میں کوئی صاحب قاضی عبدالحمید صاحب (رجسٹرار محمڈن میرجنز) کو مرزا صاحب نے آج ایک خط لکھوایا:

جناب قاضی صاحب مصدر عنایت و کرم سلمہ اللہ تعالیٰ۔ سلام مسنون کے بعد دعا نگار ہوں کہ آپ کا عنایت نامہ پہونچا، جس میں ایک دعائیہ شعر بھی تھا۔ بی فرشتن صاحبہ مع بابو خدا بخش کے پہونچیں، میرا مکان بھی آسمان ہے کہ بی فرشتن کا نزول ہے، میں رند خراباتی اور وہ زاہد مناجاتی، دیکھئے کیا ہو۔ ابھی مجھے اس پردے میں یہ نہیں معلوم ہوا کہ وہی ہیں یا کوئی اور۔

۱۶ر فروری ۱۹۰۲ء

آج کی صحبت میں بی حجاب کا ذکر خوب گرم رہا۔ مرزا صاحب کے چند بے تکلف دوست جمع تھے جو مرزا صاحب کے تمام مشوروں میں شریک رہا کرتے ہیں۔ ایک صاحب نے ازرہ تمسخر دریافت کیا کہ کیوں صاحب اب آپ کا سن یہ ہے کہ منھ میں بتیسی لگی ہوئی ہے، داڑھی اور سر کے بال خضاب و مہدی سے سیاہ و سُرخ کئے جاتے ہیں، آخر کس برتے پر آپ حجاب سے نکاح کرنے پر مایل ہیں۔ مرزا صاحب نے فرمایا کہ نکاح کر کے عام اصطلاح میں حجاب کو میں اپنی بیوی نہیں بناؤں گا، بلکہ رفیق بناؤں گا، مجھے اپنی کبرسنی کا احساس ہے، منھ میں قدرتی دانتوں کی بجائے بتیسی بھی مجھے محسوس ہوتی ہے، دسمہ اور مہندی بھی ہفتہ میں دو دفعہ لگتی ہے، میری مسہری بھی ایک نوعروس کی مسہری معلوم ہوتی ہے، رنگین جالی کے پردے جن پر گوٹا اور پٹھا ٹکا ہوا ہے، انگوری بیل کی جھالر بھی لہرا رہی ہے تو پھر جب یہ سب باتیں مجھے روا ہیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ منی بائی حجاب میرے لئے جایز نہ کر دیجائے۔ اس عمر میں مجھے بیوی سے زیادہ ایک ہمدرد کی ضرورت ہے، میں سمجھتا ہوں کہ پہلی بیوی، بیوی ہوتی ہے، دوسری بیوی رفیق ہوتی ہے اور تیسری بیوی درحقیقت جان کا جنجال

مرزا صاحب کی اس گفتگو نے سب کو ساکت کر دیا۔

۲۱ر فروری ۱۹۰۲ء

مرزا صاحب درحقیقت بڑے شگفتہ مزاج واقع ہوئے ہیں، بڑھاپے کا عالم بھی جوانی کا عالم معلوم ہوتا ہے وہی مذاق وہی دل لگی۔ چھوٹی چھوٹی تین چار لڑکیوں کو پرورش کیا ہے۔ صاحب جان اور امیری بڑی چنچل لڑکیاں ہیں جب اُن کے پاس کوئی نہ ہوتا تو اُن کو بُلاتے، اُن سے مزے مزے کی باتیں کرتے اور وہ مرزا کا دل بہلایا کرتیں۔ مرزا اُن سے خوب کھُل کر ہنسی مذاق کرتے کبھی کہا کرتے کہ امیری میرا دل چاہتا ہے کہ میں تیرے ساتھ شادی کر لوں وہ جواب دیتی کہ سرکار آپ کے سر کے بال سفید، منھ میں دانت ندارد، میں آپ سے شادی کر کے کیا کروں گی۔ آج شام کو جب میں پہونچا تو مرزا صاحب انھیں رنگ رلیوں میں محو تھے، میرے پہونچتے ہی صاحب جان اور امیری ہرنیوں کی طرح چھلانگیں مارتی ہوئی گھر میں بھاگ گئیں، مرزا نے مجھے دیکھ کر برجستہ یہ شعر پڑھا:

دن گزارے عمر کے انسان ہنستے بولتے　　جان بھی جائے تو میری جان ہنستے بولتے

۲۷ر فروری ۱۹۰۲ء

مرزا صاحب ہفتہ میں دو تین مجرے ضرور سنا کرتے تھے، مگر جب سے حجاب کلکتے سے آئی تھیں پہلا معاہدہ اُن سے یہ ہوا تھا کہ کوئی طوایف یہاں نہ آنے پائے۔ آج شام کو حجاب کے بھائی خدا بخش بیٹھے تھے میں بھی موجود تھا۔ مرزا صاحب

مخصوص خدا بخش کو چھیڑنے کے لئے اکثر طوائفوں کا ذکر کیا کرتے تھے اور خصوصاً اختر جان سورت والی کا ذکر ضرور کرتے تھے وہ حجاب کے آنے سے پیشتر کوئی دو برس تک مرزا صاحب کے پاس نوکر بھی رہی تھی۔ خدا بخش کو یہ معلوم تھا کہ میری بہن سے مرزا صاحب کا معاہدہ ہو گیا ہے لہذا کبھی کبھی خدا بخش بھی مرزا کو چھیڑا کرتے تھے، آج وہ بولے کہ حضرت آج رحمت اللہ (مرزا کا گویا) کہتا تھا کہ ایک نئی رنڈی آئی ہوئی ہے اور حسن و سن کے ساتھ ساتھ گانا بھی لاجواب ہے۔ مرزا نے برجستہ جواب دیا کہ کیا تمہاری بہن سے بھی اچھی ہے۔ خدا بخش جھینپ کر رہ گئے، مرزا بولے کہ چلو آج اُسے بلا کر ہم گانا سنیں اور تم حجاب کی گالیاں سُن لینا۔ حساب برابر ہو جائے گا۔

یکم اپریل ۱۹۰۲ء

میں بیٹھا ہوا تھا، مرزا صاحب کے یہاں ایک شیخ جی نوکر ہیں، دلی کے رہنے والے بڑھے فقرا کے دل دادہ، دنیا کا کوئی ولی ایسا نہیں جس کا نام نہ جانتے ہوں، حیدر آباد کے چند بزرگ مشہور ہیں وہاں ہر جمعرات کو جاتے ہیں، شب وہیں بسر کرتے ہیں مرزا صاحب کے پاس آئے تو ایک طوائف بیٹھی ہوئی تھی، جو نام سن کر سلام کرنے آئی تھی، طوائف کے اُٹھ جانے کے بعد شیخ جی مرزا صاحب کو نصیحتیں کرنے لگے کہ آپ اب تو ان چڑیلوں کا پیچھا چھوڑئے، اپنی عاقبت کیوں خراب کرتے ہیں، مرزا صاحب عام طور سے ان کی باتیں پی جایا کرتے تھے، جب وہ نصیحتیں ختم کر چکے تو فی البدیہہ یہ شعر پڑھا:

کیا ہے ناک میں دم واعظوں نے کیا کہئے　　غضب ہے دین کا دنیا میں نام لیتے ہیں

---

۲۱ اپریل ۱۹۰۲ء

آج مرزا صاحب بہت سست نظر آتے تھے، شام کو میر مردان علی تشریف لائے وجہ افسردگی پوچھی، مرزا صاحب نے فرمایا کہ جب سے حجاب آئی ہیں بجز اُن کے دوسری صحبت نہیں رہی، مجرا سن کر دل بہلا لیا کرتے تھے، وہ بھی ختم کبھی کبھی کوئی طوائف سلام کے لئے آجاتی ہے تو وہ بھی اُن کو ناگوار ہے، بتاؤ جس شخص کی گھٹی میں حسن پرستی و نغمہ پرستی ہو وہ کس طرح اس قید و بند کو برداشت کر سکتا ہے۔ بڑی دیر تک اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں بالآخر خود سوچ کر بولے کہ اچھا یار ایک ترکیب سمجھ میں آئی ہے اور وہ یہ کہ آئندہ سے اپنے دوستوں کے یہاں مجرے ہوا کریں، روپیہ ہم صرف کریں اور نام ہو یاروں کا۔

---

۲۷ اپریل ۱۹۰۲ء

آج سہ پہر سے شام تک مرزا صاحب پتنگ بازی دیکھتے رہے، کبھی خود بھی پتنگ اُڑایا کرتے تھے مگر اب صرف اتنا رہ گیا ہے کہ صحن مکان میں بیٹھے بیٹھے مرزا خورشید عالم کو پتنگ اُڑاتے ہوئے دیکھ لیا کرتے ہیں۔ مرزا کو قریب قریب تمام بازیوں کا

کم و بیش شوق رہا ہے بیڑ بازی، کبوتر بازی گو خود نہیں کرتے لیکن دوسروں کے شغل میں شریک ضرور ہو جاتے ہیں موسیقی سے تو انھیں فطری لگاؤ ہے اور اس مذاق کے اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ چھوٹے پیمانہ پر خواجد علی شاہ ہیں، ستار نواز، بین نواز، گویئے، ڈوم، ڈھاڑی اور ان سب کی پیشوا رنڈیاں اُن کی صحبت کا لازمہ ہیں۔ طبلہ خود بھی بجاتے ہیں، ستار میں بھی کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ دو تین راگ راگنیاں خود بھی ایجاد کی ہیں۔ شاہ ظفر کا ایجاد کیا ہوا ایک راگ بہت بجاتے ہیں۔ حیدر آباد کے قیام میں ایک رنڈی ہمیشہ ان کے پاس ملازم رہی۔ الغرض یہ کہ مرزا صاحب کے شب و روز عیش میں گزرتے ہیں، منی بائی حجاب کے آنے کے بعد گو ان کا پروگرام بالکل بدل چکا ہے لیکن ان کی تشریف آوری سے پہلے کون سا دن تھا جو ان رنگ رلیوں میں نہیں گزرتا تھا۔ مغرب کا وقت گزرا اور گانا سننے کو دل چاہنے لگا، ستار نواز نوکر ہے اُس کو بلایا اور کہا کہ گا بجا۔ اُسی وقت شہر کے طائفے بھی آجاتے تھے، دکنی طوائفوں کا انھوں نے کبھی گانا نہیں سُنا لیکن دو ایک طوائفیں دکنی بھی آجایا کرتی تھیں، گھنٹوں اُن سے ہنسی مذاق رہا کرتا تھا سورت کی ایک طوائف اختر جان کوئی دو برس تک سو روپیہ ماہوار پر نوکر رہی، دکن میں وہ حور سمجھی جاتی تھی۔ خوش اندام، خوش رو، خوش وضع، خوبصورت، میانہ قد، مضطر ایسی کہ ایک جگہ اُسے قرار نہ تھا اُس کی ادائیں مرزا کے دل میں گھر کر گئی تھیں ورنہ ——— کے لائق مرزا کا سن نہیں تھا، اختر جان کچھ عرصہ کے بعد حیدر آباد سے سورت چلی گئی، مرزا صاحب اُس کی فرقت میں شکستہ دل رہنے لگے۔ لیکن حجاب کے آنے کے بعد اب یہ دنیا سب خاموش و معطل ہے۔

۱۵ر مئی ۱۹۰۲ء

آج شام کو مرزا صاحب کے یہاں منی بائی حجاب کے فوٹو کھچنے کا اہتمام تھا، بڑی زبردستیوں سے حجاب فوٹو کھچوانے پر آمادہ ہوئی تھیں، مرزا صاحب بہ ضد تھے کہ دونوں کا فوٹو ایک جگہ ہونا چاہئے، حجاب کو اس پر اعتراض تھا۔ فوٹو گرافر مکان پر موجود اور عاشق و معشوق میں جھگڑا ہو رہا ہے کوئی فیصلہ نہیں ہوتا، آخر فوٹو گرافر نے اس جھگڑے کو اس طرح ختم کیا کہ مرزا صاحب کو اشاروں اشاروں میں کچھ سمجھا دیا۔ مرزا صاحب حجاب کی کرسی سے کچھ ہٹ کر پیچھے بیٹھ گئے، فوکس لیا گیا، منی بائی کو بھی یقین رہا کہ صرف میرا فوٹو لیا جا رہا ہے لیکن فوٹو گرافر نے باہر آکر مرزا صاحب کو یقین دلایا کہ وہ عاشق و معشوق کا یکجائی فوٹو پیش کرے گا۔ فوٹو گرافر کے رخصت ہونے کے بعد مرزا نے فی البدیہہ یہ رباعی ارشاد کی:

تم تو فلکِ حسن پہ ہو ماہ منیر — سائے کی طرح ساتھ ہے داغ دلگیر
خالِ لبِ گلفام ہے شاہد اس کا — بے داغ نہ کھنچ سکی تمہاری تصویر

۳۰ر مئی ۱۹۰۲ء

آج شام کو مرزا صاحب فرمانے لگے کہ کچھ سُنا نکاح کا تقاضہ ہو رہا ہے، عدت کے دن پورے ہو چکے ہیں۔ میں بھی

طیار ہوں، اس کے بعد یہ شعر پڑھا:

برائے نام نکالے فلک مرے ارماں جو ہے نکلنے کی حسرت کہاں نکلتی ہے

پھر فرمایا کہ بڈھے ہو گئے، منہ میں دانت نہیں، پیٹ میں آنت نہیں، نکاح کا ماحصل اور جزو اعظم دونوں کے پاس ندارد

وقتِ آخر ہوا مگر اے داغ ہوسِ زندگی نہیں جاتی

---

۳۱ مئی ۱۹۰۲ء

پنجۂ فولاد کے نام سے مرزا صاحب کے ایک شاگرد محمد الدین فوق نے لاہور سے ایک اخبار نکالا ہے، اڈیٹر صاحب نے اخبار بھیجا ہے اور اس کی تاریخ کی فرمایش کی ہے، مرزا صاحب نے آج اُس کی تاریخ کہہ کر روانہ کرائی اور فوق صاحب کو لکھا کہ نہیں معلوم کس مناسبت سے اس اخبار کا نام آپ نے پنجۂ فولاد رکھا ہے، گزشتہ محرم میں مجھے سلام کرنے ایک طوائف آئی تھی، نام پوچھا تو بولی مجھے فولاد جان کہتے ہیں، میں نے پوچھا کہ تم میں کیا کیا جوہر ہیں، اُس نے مرثیہ کے چند بند سُنائے میں نے اُسے رخصت کر دیا لیکن آج مجھے معلوم ہوا کہ "پنجۂ فولاد" فولاد جان کا نرہ ہے۔

---

۲ جون ۱۹۰۲ء

مرزا صاحب کی حیات میں کئی دفعہ ان کے انتقال کی بے بنیاد خبر اُڑ گئی، آج مرزا صاحب کے ایک شاگرد نے خود مرزا صاحب کو خط لکھ کر اس قسم کی غلط خبروں کی وجہ معلوم کرنا چاہی۔ مرزا صاحب نے ان کو یہ جواب لکھوایا:

"عمر کے دن گزرتے جاتے ہیں جیتے جی ہم تو مرتے جاتے ہیں

حکیم صاحب مسیحائے زماں سلمہ الرحمٰن۔ سلام مسنون کے بعد مدعا نگار ہوں کہ آپ کا کارڈ پہونچا آپ نے میرے انتقال کی جو خبر سنی میں بھی اس کو سچ سمجھتا ہوں:

روز مرتا ہوں روز جیتا ہوں زندگی کا کوئی حساب نہیں

آپ نے تو ایک دفعہ میرے مرنے کی خبر سنی میں ہر سال سنتا ہوں اور اسی کو اپنی سالگرہ سمجھتا ہوں، مجھے افسوس ہے کہ جس رئیس نے میرے زندہ ہونے کی تصدیق کی تھی وہ بیچارے خود چل بسے۔ خدا ان کو جنت نصیب کرے اور مجھے بھی اور آپ کو بھی، میں آپ کا ممنون ہوا کہ اس دل سوزی سے داغ کو یاد فرمایا، عمرت دراز باد کہ اینہم غنیمت است۔

---

۱۵ جون ۱۹۰۲ء

آج کی صحبت میں مرزا صاحب نے اپنی اہلیہ کا ذکر کیا اور دیر تک ان کی محبت، اطاعت اور خلوص کے واقعات بیان

گرتے رہے، اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا کے دل میں اپنی بیوی کا بڑا احترام تھا، انھوں نے بتایا کہ میری بیوی کا یہ طریقہ تھا کہ ہر سال عید اور بقرعید کے موقع پر وہ سر و قد کھڑی ہو کر مجھے تعظیم دیا کرتی تھیں، مرزا صاحب نے فرمایا کہ ایک روز جب کہ وہ سخت بیمار تھیں اور زیست کی امید باقی نہیں رہی تھی میں نے اپنے جرموں اور بے اعتدالیوں کا عفو چاہا، اسی وقت کیا دیکھتا ہوں کہ گھر کے اور تمام لوگ بھی ان کے گرد جمع ہو کر اپنا اپنا کہا سنا معاف کرا رہے ہیں، مرحوم سب کو معاف کر رہی ہیں، میرا دل بھر آیا، آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے، میں نے نہایت منت و سماجت سے اور پوری مجبوری کے عالم میں ان سے کہا کہ میری بھی خطا معاف کر دو۔ بی بی نے کہا کہ میں تمھاری خطائیں کبھی معاف نہیں کروں گی، مرزا صاحب نے دوبارہ التجا کی، پھر بھی یہی جواب ملا، مرزا صاحب نے کہا کہ پھر تو میں نے خدا کی قسم کھا کر کہا کہ اگر تم میری خطائیں معاف نہیں کرتی ہو تو میں بھی تم کو کبھی معاف نہیں کروں گا، یہ کہہ کر وہاں سے چل دیا۔ جمعرات کے روز ان کا انتقال ہوا تو مجھے بلایا اور فرمایا کہ اُس روز میں تم کو آزماتی تھی تم ایسے خفا ہوئے کہ پھر آئے بھی نہیں اچھا لو اب میں تم کو معاف کرتی ہوں تم بھی مجھے معاف کر دو۔ مرزا صاحب نے بتایا کہ ایک دفعہ بیوی نے مجھ سے سوال کیا کہ تم میرے بعد نکاح تو نہیں کرو گے، مرزا صاحب نے پوچھا کہ اس سے تمھارا کیا مطلب ہے، انھوں نے فرمایا کہ صرف اتنا کہ اگر کرو گے تو بہشت میں تمھارے ساتھ میری سوکن بھی ہوگی اور ایسی بہشت میں میرا گزر ہرگز نہیں ہوگا، ایسی بہشت تم کو ہی مبارک رہے۔

مولوی افتخار عالم صاحب مارہروی کے لکھے ہوئے روزنامچہ میں مرزا داغ دہلوی کی جنسی زندگی سے متعلق بس اسی قدر یادداشتیں ملتی ہیں، جو بڑی حد تک نامکمل ہیں اور ان سے یہ پتا نہیں چلتا کہ آخر بی منی بائی حجاب کا اس کے بعد کیا حشر ہوا، حضرت داغ سے نکاح ہوا یا وہ اسی طرح رونقِ محفل رہیں، ممکن ہے کہ اس مضمون کی روشنی میں کوئی اور صاحب اسکی آئندہ کڑیاں ہدیۂ ناظرین کر سکیں اور داغ کی یہ زندگی پوری طرح واضح ہو سکے۔ چلتے چلاتے اس مسودہ سے ایک یادداشت اور پیش کرتا ہوں جس سے آپ اس روزنامچہ کی ترتیب وغیرہ کا اندازہ کر سکیں گے اور شاید اس یقین پر بھی مجبور ہوں گے کہ اس قسم کے روزنامچہ کی ترتیب خفیہ نہیں تھی بلکہ مرزا داغ دہلوی اس سے واقف و آگاہ تھے۔

۲۹ر جنوری ۱۹۰۲ء

صبح کے نو بجے تھے، مرزا صاحب کے پاس راقم (افتخار عالم صاحب) اور سید علی حسن (احسن مارہروی) بیٹھے ہوئے تھے، غزلوں پر اصلاح ہو رہی تھی۔ مولوی شبلی نعمانی اور ظفر علی خاں مرزا صاحب کی ملاقات کو تشریف لائے، مولوی ظفر علی خاں سے یہ پہلی ملاقات تھی، اثنائے گفتگو میں ظفر علی خاں نے ہم دونوں کو مخاطب کر کے کہا کہ آپ لوگ بڑے خوش قسمت ہیں کہ ایسے بے ہمتا اور بے بدل شاعر کی صحبت میں رہ کر فیوض حاصل کرتے ہیں، مولوی شبلی نے اس پر فرمایا کہ زمانۂ جاہلیت عرب میں یہ قاعدہ تھا کہ بڑے بڑے شاعر مثلاً لبید وغیرہ وغیرہ کے ساتھ ایک ایک شخص رہا کرتا تھا جس کو عرب والے مبالغہ کر کے ردایہ کہا کرتے تھے، اسی طرح فصیح الملک بہادر کے یہ دونوں ردایہ ہیں، مرزا صاحب نے فرمایا کہ آپ انھیں ردایہ کہئے میں تو کراماً کاتبین میں انھیں شمار کرتا ہوں یہ دونوں تو میری نظر کے سامنے رہتے ہیں اور دو نظروں سے غائب میرے کندھوں پر۔

سید رفیق مارہروی

جنگ کے لئے طیار ہے؟

لڑائی میں کامیابی کا انحصار اس وقت صرف صنعت و اقتصاد پر ہے اور ان دونوں باتوں میں روس، امریکہ سے بہت پیچھے ہے۔

روس بہ لحاظ وسعت، جرمنی سے ۴۵ گنا زیادہ ہے، لیکن اس کا نصف سے زیادہ حصہ جنگل ہے، اور تقریباً پانچواں حصہ ریگستانی۔ گویا اس کی سرزمین کا صرف آٹھواں حصہ ایسا ہے جسے ہم صحیح معنے میں زرخیز کہہ سکتے ہیں۔

روس کی آبادی ۱۹ کروڑ ۲۰ لاکھ ہے اور امریکہ کی ۱۴ کروڑ ۲۰ لاکھ، اور آبادی کی پرورش کے لئے رقبۂ زمین جتنا امریکہ کے پاس ہے اتنا ہی روس کے پاس ہے، حالانکہ تقریباً ڈیوڑھا ہونا چاہئے، اور اسی لئے غذا کی پیداوار روس میں بہ لحاظ آبادی بہت کم ہے۔ علاوہ اس کے روس کی ۵ کروڑ آبادی دور دراز صحراؤں اور جنگلوں میں پھیلی ہوئی ہے اور وہ غذائی پیداوار میں کوئی مدد نہیں کر سکتی۔

روس کی صنعت ایک مثلث کی شکل میں پھیلی ہوئی ہے، لینن گراڈ اور اوکرین سے لیکر وسط سائبیریا تک۔ اور یہ رقبہ، روس کی وسعت کو دیکھتے ہوئے بہت کم ہے اور غیر محفوظ بھی ہے، علاوہ اس کے صنعتی کاروبار میں جتنا سرمایہ لگا ہوا ہے وہ اتنا ہی ہے جتنا ۴۸ سال قبل امریکہ کا تھا۔

جنگ نے یونہی جرمنی، اٹلی، جاپان اور انگلستان سبھی کو نقصان پہونچایا ہے، لیکن روس کا سب سے زیادہ نقصان ہوا ہے۔ اس کی ریل گاڑیاں اور انجن ۵۸ فی صدی تباہ ہوئے، لوہے کی پیداوار کو ۴۵ فی صدی نقصان ہوا، بجلی پیدا کرنے کے آلات ۴۴ فی صدی ضایع ہوئے، کویلہ کی پیداوار کو ۵۵ فی صدی نقصان پہونچا، ایک چوتھائی جانور ہلاک ہوئے اور لاکھوں گھر برباد۔

جنگ کے ختم ہونے پر امریکہ کی اقتصادی حالت ۲۵ فی صدی خراب تھی اور روس کی ۴۲ فی صدی۔ اگر اب کوئی جھگڑا نہ ہوا اور روس اپنے پروگرام کے مطابق برابر ترقی کرتا جائے تو اس کی صنعتی پیداوار ۱۹۵۱ء میں اس نقطہ پر پہونچے گی جہاں امریکہ ۱۹۰۴ء میں تھا۔ اور ۱۹۶۰ء اس نقطہ پر جہاں امریکہ ۱۹۱۸ء میں تھا۔

جب فروری ۴۶ء میں اسٹالن نے اپنا چوتھا پنج سالہ منصوبہ پیش کیا تو اس نے اپنی تقریر میں ظاہر کیا کہ "کاشت اور صنعت میں قبل از جنگ کی حالت تک پہونچکر اور آگے بڑھنے کے لئے ہم کو کم از کم پندرہ سال درکار ہونگے"۔

اسٹالین نے یہ بھی ظاہر کیا تھا کہ تیل کی پیداوار کے سلسلہ میں اس کا نصب العین یہ ہے کہ ۱۹۵۱ء تک ہم سالانہ ۶ کروڑ ٹن تیل نکال سکیں۔ حالانکہ پٹرول کی پیداوار امریکہ میں ۲۸ سال قبل اتنی تھی اور ۱۹۴۷ء میں تو امریکہ نے ۲۷ کروڑ ٹن تیل نکالا۔

روس میں پٹرول کی پیداوار اتنی کم ہے کہ پٹرول کی جگہ اسے اکثر جگہ کویلہ اور دوسرے ایندھنوں سے کام لینا پڑتا ہے چنانچہ ۷۰ فی صدی کویلہ صرف انجنوں اور ۳۰ فی صدی بجلی پیدا کرنے میں صرف ہو جاتا ہے اور اُن صنعتوں کے لئے جن کو واقعی کویلہ کی ضرورت ہے، صرف ۴۰ فی صدی کویلہ میسر آتا ہے، روس کا نصب العین یہ ہے کہ ۱۹۵۱ء تک کویلہ کی پیداوار ۵۰ کروڑ ٹن تک پہونچ جائے، حالانکہ امریکہ میں ۳۰ سال قبل ہی کویلہ کی اتنی پیداوار تھی۔

لوہے کے متعلق اسٹالن کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ موجودہ پنج سالہ منصوبہ کے اختتام تک وہ ۶ کروڑ ٹن لوہا نکال سکے حالانکہ امریکہ پچھلی لڑائی کے دوران میں بھی اس سے ۵۰ گنا زیادہ لوہا نکال رہا تھا۔

جنگ کے لئے جن اشیاء یا دھاتوں کی ضرورت ہے وہ بھی روس میں بہت کم پیدا ہوتی ہیں، خصوصیت کے ساتھ ربر کہ اس کا تو وہاں تقریباً بالکل فقدان ہے۔ اس کے قبضہ میں ایسے محفوظ بحری راستے نہیں کہ وہ باہر سے اصلی ربر حاصل کر سکے اور مصنوعی ربر طیار کرنے کے لئے جن پیچیدہ مشینوں کی ضرورت ہے وہ بھی اس کے پاس نہیں ہیں۔

روس کی بڑی کمزوری اس کے ذرائع حمل و نقل سے تعلق رکھتی ہے۔ یونتو اس کے پاس جہاز کافی ہیں، جنگ سے قبل اس کے جہازوں کا مجموعی وزن ۱۰ لاکھ ٹن سے زیادہ نہ تھا لیکن دوران جنگ میں ادھار پٹہ پر امریکہ سے اور بعد از جنگ جرمنی، اٹلی اور فنلینڈ سے مال غنیمت کی صورت میں جو جہاز اسے ملے ہیں، ان کی تعداد کافی ہے، لیکن اسکے اندرونی ذرائع نقل و حمل بہت ناکافی ہیں۔ وہاں سڑکیں بہت کم ہیں اور جو ہیں وہ اچھی نہیں اور سوا اُن چند سڑکوں کے جو خصوص بڑے بڑے شہروں کو جاتی ہیں، وہاں کوئی قابل ذکر سڑک نہیں ہے اور موٹر ٹرک وہاں صرف شہروں کے اندر ہی آجا سکتے ہیں۔

مغربی یورپ میں نہروں کے ذریعہ سے بھی نقل و حمل کا کام بہت لیا جاتا ہے، لیکن بدقسمتی سے روس میں نہریں نہیں ہیں اور صرف چند بڑے بڑے دریاؤں سے یہ کام لیا جا سکتا ہے، لیکن وہ بھی اکثر منجمد حالت میں رہتے ہیں اس لئے روس مجبور ہے کہ اپنا اسباب ۸۳ فی صدی ریل کے ذریعہ سے اِدھر اُدھر سے منتقل کرے اور ریل کی حالت وہاں بہت خراب ہے، اور امریکہ کے مقابلہ میں وہ ۷۶ سال پیچھے ہے۔

اس وقت سارے روس میں ریل کی سڑک ۵۰ ہزار میل ہے، برخلاف اس کے امریکہ میں ۲ لاکھ ۲۶ ہزار میل ہے اور یہ اتنی بڑی کمی ہے جس کو روس عرصۂ دراز تک پوری نہیں کر سکتا اور بغیر ریل کی آسانی کے صنعتی ترقی ممکن نہیں۔

ریلوے کی تعمیر کے متعلق روس کی جدید منصوبہ بندی میں نئی ریلوے لائن کی تعمیر صرف ۴۵۰۰ میل تک محدود ہوگی کیونکہ سب سے پہلے اسے ان ریلوے لائنوں کو ٹھیک کرنا ہے جو جنگ میں تباہ ہو چکی ہیں۔ اُن انجنوں کے سوا جو جرمنی سے

اسے ملے میں خود روس کے انجن سب کے سب پرانے ہیں اور اب نئے انجن امریکن انجنوں کی طرح طیار کئے جائیں گے اور اس کے لئے کافی وقت چاہئے۔

موٹر سازی کے کارخانے بھی روس میں بہت ناکام ہیں، اور ان کی بنائی ہوئی موٹروں کی عمر آٹھ ہزار میل سے زیادہ نہیں۔ لیکن اب انھیں امریکی اور انگریزی ڈزائن کے موٹر طیار کرنے کی طرف توجہ ہوئی ہے۔

روس کے کارخانوں میں بہ نسبت امریکہ کے بہت زیادہ آدمیوں سے کام لیا جاتا ہے، جس سے ان مشینوں کی خامی اور بدنظمی ظاہر ہوتی ہے۔ صنعتی مشینری کے چلانے کے لئے امریکہ میں صرف ۱۵ کاریگر چاہئے، روس ۴۸۰ آدمی درکار ہوتے ہیں، اس طرح کارخانوں کے دفتری کام کے لئے امریکہ میں صرف سترہ آدمیوں سے کام لیا جاتا ہے، اور روس کو ۹۱ کلرک مقرر کرنے پڑتے ہیں۔ امریکہ میں ۱۰۰۰ کلوواٹ برقی قوت پیدا کرنے کے لئے صرف دو آدمی کافی ہوتے ہیں، لیکن روس میں گیارہ آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

کویلہ کی معدنوں کا یہ حال ہے کہ امریکہ میں ۹۰ فی صدی کویلہ مشین کے ذریعہ سے کھودا جاتا ہے، ۶۰ فی صدی مشین ہی کے ذریعہ سے باہر لایا جاتا ہے اور صرف چار فی صدی حصہ ایسا ہوتا ہے، جس کے لئے کدال اور پھاوڑہ چلانے والے آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن روس میں یہ سارا کام تقریباً ہاتھ ہی کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔

کاریگروں کی تعداد قابلیت میں بھی دونوں جگہ بہت فرق ہے۔ روس کی آبادی اس میں شک نہیں بہت زیادہ ہے لیکن ٹکنکل ماہروں کی اتنی کمی ہے کہ اب سے ۳۰ سال قبل امریکہ میں جتنے کاریگر پائے جاتے تھے، روس میں ان کے نصف شاید ۱۹۶۰ء تک پہونچیں۔ ۱۹۳۹ء تک روس نے صرف ۱۰ لاکھ کاریگر پیدا کئے اور نئی منصوبہ بندی میں ان کی تعداد کا اندازہ ۶۰ لاکھ کیا جاتا ہے، لیکن امریکہ میں اتنی تعداد تو صرف ٹرک چلانے والوں اور موٹر کی مرمت کرنے والوں کی ہے۔

اب ایٹم بم کو لیجئے، تو معلوم ہوگا کہ اس میں بھی روس بہت پیچھے ہے۔ روس ایٹم بم بنانے کے اصول سے تو واقف ہے۔ لیکن اس کے لئے جتنی اہم، نازک اور پیچیدہ مشینریوں کی ضرورت ہے وہ روس کے پاس نہیں ہیں اور جس وقت تک روس یہ مشینریاں بنائے گا، امریکہ خدا جانے اور کتنی ترقی کر چکا ہوگا۔

الغرض ان حالات میں روس خود اپنی طرف سے تو لڑائی چھیڑنے کی ہمت نہیں کر سکتا، لیکن اس کی جغرافی پوزیشن ضرور ایسی ہے کہ اگر کسی اور ملک نے اس پر حملہ کیا، تو وہ مدافعت پوری طرح کر سکے گا اور اسی میں اس کی جیت ہے۔

مالہ وماعلیہ

حضرت نیاز کے ان تمام مقالات کا مجموعہ جن میں عصر حاضر کے اکابر شعراء کے کلام پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ قیمت علاوہ محصول عا
دو روپیہ

آل احمد سرور کی تنقید نگاری

ترقی پسند ادبی تحریک کی ایک ممتاز خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے اُردو کے کسی ادیب کو متاثر کئے بغیر نہیں چھوڑا۔ ہماری نسل کے بہت سے نئے لکھنے والے اسی تحریک کی پیداوار ہیں، کچھ ایسے ہیں جو اس رجحان سے پیشتر ہی قلم سنبھال چکے تھے لیکن ان کی تخلیقات میں جان، ان کی فکر میں گہرائی، ان کی نظر میں وسعت اسی تحریک نے پیدا کی۔ جہاں بہت سے نئے لکھنے والے اس کی طرف کھنچے، وہاں بہت سے پُرانے ادیبوں نے اس سے انحراف بھی کیا۔ اس طرح ادب میں دو پارٹیاں بن گئیں ایک جدید ادب کی پرستار، دوسری پُرانے ادب کی دلدادہ۔ اُردو میں خال ہی خال ایسے ادیب باقی رہ گئے جنھیں غیر جانبدار کہا جا سکے۔ جنھوں نے پُرانے ادب سے بہرہ ور ہوتے ہوئے بھی نئے ادب کا ہمدردی مائل نظری اور بے غرضی سے مطالعہ کیا ہو، اسے وبا سمجھ کر اس سے گریز کیا ہو یا نیا فیشن سمجھ کر اسے اختیار نہ کیا ہو۔ بلکہ اس کے محاسن و معائب پر خلوص اور ٹھنڈے دل سے غور و فکر کیا ہو، آل احمد سرور ایسے ہی لوگوں میں سے ہیں۔ بعض حضرات انھیں ترقی پسند سمجھتے ہیں اور جہاں تک انکے ادبی میلانات یا نظریات کا تعلق ہے وہ ہیں بھی ترقی پسند۔ لیکن انھوں نے کبھی ترقی پسندی کی خاطر زبان کی تاہمواری یا خیال کی سطحیت کو گوارا نہیں کیا۔ سستے قسم کے پروپیگنڈے، فحاشی اور ابہام کو ادب نہیں ٹھیرایا۔ غزل کو وحشی صنف ادب یا قدیم ادبی سرمایہ کو قابل سوختنی نہیں سمجھا وہ قدیم و جدید کے قایل ہی نہیں بلکہ اقبال کی طرح اسے کم نظری پر محمول سمجھتے ہیں وہ ماضی و حال میں ایک واضح اور متوازن تسلسل دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک وہ ادب جو ماضی کو نظر انداز کر دیتا ہے خود بھی نظر انداز کر دینے کے قابل ہے۔ ہاں ادب ماضی کے سرمایہ سے مستفیض ہو سکتا ہے لیکن ماضی پرست نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح حال کے اثرات کو قبول کرنے کے لئے اپنے دل و دماغ کے دریچے کھلے نہ رکھنا، یا مستقبل کے امکانات کو فراموش کر دینا گویا خود کو ختم کر دینا ہے۔

پروفیسر کلیم الدین احمد نے لکھا ہے کہ اُردو نقاد شعوری یا غیر شعوری طور پر ادب کے بنیادی مسایل کی مشکلات سے واقف ہیں اس لئے وہ اس موضوع پر قلم نہیں اُٹھاتے۔ عجیب بات ہے سرور صاحب نے بھی اس موضوع پر بہت کم لکھا ہے۔ ان کے اس نوع کے صرف دو مضامین ملتے ہیں۔ نیا ادبی شعور اور تنقید کیا ہے؟ لیکن اپنے دیگر مضامین میں جہاں انھوں نے ضمنی طور پر بعض ادبی مسایل کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا ہے ان کے نقطۂ نظر کی صحت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی کا کیا مطلب ہے؟ ادب اور پروپیگنڈے میں کیا فرق ہے؟ شاعری کا کوئی

مقصد ہے یا نہیں ؟ مواد اور اسلوب میں کیا ربط ہے ؟ ادب میں ماضی حال اور مستقبل کی کیا اہمیت ہے ؟ ادب میں داخلیت ؟ ادب میں داخلیت اور خارجیت، اجتماعیت اور انفرادیت کہاں تک ناگزیر ہیں اور ان میں باہمی مناسبت کیا ہے ؟ تجربہ اور تجربہ میں کیا فرق ہے ؟ یہ اور اسی قسم کے اور بہت سے مسایل پر کہیں نہ کہیں ان کے مضامین میں روشنی پڑتی ہے جنھیں دیکھ کر ان کی اصابت رائے اور فکر و نظر کی بلندی کا قایل ہونا پڑتا ہے۔

"نیا ادبی شعور" میں انھوں نے ادبی شعور سے متعلق بعض سوالات حل کرنے کی کوشش کی ہے "ادبی شعور سے کیا مراد ہے ؟ یہ کیسے حاصل ہوتا ہے اور کن حالات میں اس کی نشو و نما ہو سکتی ہے ؟ اس کا سماج کی تہذیبی زندگی میں کیا حصہ ہے، قوموں اور تاریخوں کے بننے بگڑنے میں اس کا کیا دخل ہے ؟" لیکن ادبی شعور سے کیا مراد ہے، اس کی صاف اور واضح الفاظ میں تعریف نہیں کی گئی البتہ مختلف حالات میں بدلتے ہوئے ادبی شعور کا ضرور جایزہ لیا گیا ہے۔ نیز غالب حالی، اقبال اور جوش وغیرہ کے دور قایم کئے گئے ہیں اور ان ادوار میں جو گوناگوں تبدیلیاں ادبی شعور میں ظاہر ہوئیں انھیں پوری طرح اجاگر کیا ہے۔ سرور صاحب ایک ایسا ادبی شعور چاہتے ہیں جو نیا ہو مگر نئے پن کے جوش میں اس غذا سے انکار نہ کر دے جس کی بدولت اس کے جسم کی نشو و نما ہوئی ہے۔ جو مغرب کی ہواؤں کے لئے اپنے ذہن کے دریچے کھلے رکھے مگر یہ نہ بھولے کہ ہندوستان کا بھی ایک مزاج ہے۔ جو نقالی کے بجائے ہمدردی، رواداری اور وسعت قلب کے ساتھ ہر اچھی مفید اور زندہ تحریک کو دعوت دے۔ جو غلطیاں کرنے اور بھدے اور بھونڈے تجربہ کرنے سے نہ گھبرائے مگر تجربوں کو تجربہ کیے، ان پر ایمان نہ لے آئے"۔ اسی طرح وہ ادب کو ادب مانتے ہوئے بھی اسے محض شیریں دیوانگی یا من کی موج کی تفسیر تک محدود نہیں رکھنا چاہتے۔ اس سے سماج اور اس کی ضروریات کا بھی کام لینا چاہتے ہیں۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ ادیب اپنی انفرادیت ختم کر دے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ وہ اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے بھی اپنے ماحول اور اس کے اثرات قبول کرنے کے لئے طیار رہے اور ان علوم و فنون کی واقفیت سے جی نہ چرائے جن سے سماج کی تعمیر اور ترقی میں مدد ملتی ہے۔ اسی طرح وہ عریانی اور فحاشی سے بچنا چاہتے ہیں اور آج سے دو ایک سال پہلے اُردو ادب میں جو افسانہ نگاری کا طوفان امڈ آیا تھا اس سے بچکر ناول نگاری کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں۔ وہ موسیقی کی شاعری سے زیادہ خیالات کی شاعری اور نظم سے زیادہ نثر کی پرکاری کے قایل ہیں ۔ "تنقید کیا ہے" میں تنقید کی نپے تلے الفاظ میں تعریف نہیں کی گئی بلکہ اسے اشاروں اور مثالوں سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ فنون لطیفہ اور اسکی اصطلاحات کو جس قدر معانی و الفاظ میں جکڑنے کی کوشش کیجاتی ہے انکی روح اسی قدر تیزی سے پرواز کرتی ہے اور ہمیں ان کے محدود اور ناقص تصور کے سوا اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ تنقید کی بے اندازہ تعریفیں کی گئی ہیں، لیکن کسی تعریف کو جامع و مانع نہیں کہا جا سکتا اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ خواب کثرت تعبیر سے واقعی پریشان بن چکا ہے، شاید اسی لئے سرور صاحب نے بندھے ٹکے الفاظ میں اس کی تعریف نہیں کی بلکہ تنقید کا مفہوم، اس کا منصب اور بنیادی شرایط کو سمجھانے کیلئے

تشریح و توضیح اور اشارات و کنایات سے کام لیا ہے۔ مثلاً تنقید انتخاب کا نام نہیں مگر انتخاب سے تنقیدی شعور ضرور ظاہر ہوتا ہے۔ تنقید وہ سب کام کرتی ہے جو ایک مورخ، ماہر نفسیات، ایک شاعر اور ایک پیغمبر کرتا ہے ۔ تنقید ذہن میں روشنی پیدا کرتی ہے ۔ تنقید وضاحت ہے، صراحت ہے، ترجمانی ہے، تفسیر ہے، تشریح ہے، تحلیل ہے، تجزیہ ہے، تنقید قدریں ہی متعین نہیں کرتی ادب اور زندگی کو بھی ایک پیمانہ دیتی ہے تنقید انصاف کرتی ہے، ادنیٰ اور اعلیٰ، جھوٹ اور سچ، پست و بلند کے معیار قایم کرتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

انھیں اُردو میں تنقید کی کمی اس لئے نظر آتی ہے کہ عام طور پر اسے تخلیق کا درجہ نہیں دیا جاتا اس لئے لوگ اسے دوسرے درجہ کی چیز سمجھ کر اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے یا اگر ہوتے بھی ہیں تو اس قدر محنت اور جانکاہی سے کام نہیں لیتے جس کی یہ واقعی مستحق ہے۔ سرور صاحب نے بڑی خوبی سے اس خیال خام کو دور کیا ہے، اسی کے ساتھ انھوں نے اس سوال کا جواب بھی دینے کی کوشش کی ہے کہ ایک نقاد بہترین شاعر نہ ہوتے ہوئے بھی بہترین نقاد ہو سکتا ہے۔ جس طرح ہر اچھا شاعر تنقیدی شعور بھی رکھتا ہے اور یہ شعور حُسن کاری کی تخلیق کے وقت اس کی رہنمائی کرتا ہے اسی طرح ایک اچھا نقاد بھی قوتِ تخلیق سے پوری طرح بہرہ ور ہوتا ہے اور وہ شاعر کے احساسات و جذبات میں شریک ہونے، اس سے ہمدردی کرنے اور اس کی روح میں اترنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ عملی طور پر شاعر نہ ہوتے ہوئے بھی شاعرانہ خصوصیات کا حامل ہوتا ہے اس لئے یہ سمجھنا درست نہیں کہ ایک نقاد شاعر نہ ہونے کی وجہ سے شاعروں کے متعلق صحیح رائے قایم نہیں کر سکتا۔

تنقید کے منصب کی وضاحت کرنے کے بعد انھوں نے تنقید کے فریضہ پر بھی روشنی ڈالی ہے ان کے نزدیک تنقید کسی شے کے صرف اچھے یا صرف برے پہلو پر ہی روشنی نہیں ڈالتی اور نہ صرف دونوں پہلوؤں کی عکاسی تک ہی محدود رہتی ہے بلکہ دونوں میں سے کسی ایک کی اہمیت کا اعتراف ضروری سمجھتی ہے۔ اسی طرح ایک اچھا نقاد زبان کو خیال پر مقدم نہ سمجھتے ہوئے بھی زبان و بیان کے فنی نکات سے تغافل نہیں برت سکتا۔ وہ فن عروض سے بے نیاز نہیں رہتا اور مواد و اسلوب کے صحیح ربط سے بھی آشنا ہوتا ہے۔ وہ صحیح تاریخی شعور کا حامل ہوتا ہے اور ماضی کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے بھی نہ حال سے منھ موڑتا ہے اور نہ مستقبل کی طرف سے آنکھیں بند کرتا ہے۔ وہ نفسیات، معاشیات، سیاست اور فلسفہ کے بنیادی اُصولوں سے واقف ہوتا ہے اور ضرورت پڑنے پر ان میں سے ہر ایک یا کسی ایک سے مدد لینے میں گریز نہیں کرتا لیکن وہ جانتا ہے کہ تنقید صرف سیاسی پروپیگنڈے یا نفسیاتی گتھی کے سلجھانے کا نام نہیں، اسے معلوم ہے کہ اس کا اصل کام قدروں کی اشاعت کرنا ہے نہ کہ ایک وکیل کی طرح اپنے نقطۂ نظر کو منوانے کی جا و بیجا کوشش کرنا۔

سرور صاحب کے ادبی نظریات کو جاننے کے لئے ان کے ایک اور مضمون "موجودہ دور کے ادبی مسایل" کا مطالعہ بڑا مفید ہوگا۔ اس میں انھوں نے موجودہ ادب کے متعدد مسایل پر کافی شرح و بسط سے روشنی ڈالی ہے مثلاً ادب میں جدت اور قدامت کا کیا مفہوم ہے۔ مشرقیت سے کیا مراد ہے کہیں یہ محض ہماری مجہولیت کی پردہ دار نہیں۔ کیا مادیت اور مغربیت مترادف

الفاظ ہیں - مغربی تہذیب و تمدن ہماری زندگی کے لئے اور مغربی اُصول تنقید ہمارے ادب کے لئے کہاں تک مفید ہو سکتے ہیں - کیا ادب محض دل اور اس کے جذبات کی تصویر کشی کا نام ہے یا اس میں دماغ اور اس کو نشو و نما دینے والے علوم و فنون کی بھی ترجمانی کی جا سکتی ہے - ترقی پسندی کیا ہے، کیا تمام نیا ادب ترقی پسند ادب ہے - کیا ادب سائنس کی خشک صداقت اور قطعیت کی تاب لا سکتا ہے - یونیورسٹیوں میں ادب کی تعلیم عام کر دینے سے کیا ہمارے طلبا عیش پسند اور تخیل پرست تو نہیں ہو جائیں گے - مختصر افسانوں اور غزلوں کی مقبولیت کا راز کیا ہے - کیا غزل کو زندہ رکھنے کی ضرورت ہے یہ نثر کا دور ہے اور اب نظم کی بجائے نثر پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے ؟

یہ واضح کرنے کی ضرورت نہیں کہ اس مضمون کے علاوہ سرور صاحب کے اور بھی مضامین میں ان مسایل پر بحث ملتی ہے اور سرور پر ہی کیا مخصوص ہے، آج یہ اور ان سے ملتے جلتے اور بہت سے مسایل پر ادیب کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں اور خصوصاً ترقی پسندی کی تحریک نے جو قدامت اور جدت کا ہنگامہ برپا کیا ہے اس سے اُردو کا کونسا ادیب بے تعلقی کا دعویٰ کر سکتا ہے - سرور صاحب نہ تو قدیم کو محض بر بنائے قدیم ٹھکراتے ہیں اور نہ جدید کو نئے پن کے جوش میں گلے لگاتے ہیں - ان کے نزدیک قدیم ادب بھی اسی طرح خوبیوں کا حامل تھا جس طرح آج ہمارا جدید ادب - پرانے ادب میں زبان کی باریکیوں، فن کی لطافتوں، الفاظ کی نغمگی، اور جذبات کی پاکیزگی کا پورا پورا احساس تھا - یہ بھی زندگی سے بیگانگی نہ برتتا تھا (ادب زندگی سے بیگانہ وار رہ کر جی ہی نہیں سکتا) لیکن اس میں زندگی کی ترجمانی یک طرفہ تھی، یہ ایک مخصوص خطہ یا سوسائٹی کا ادب تھا - یہ خواص کی پسند کو زیادہ ملحوظ رکھتا تھا اور عوام کے نام پر ناک بھوں چڑھاتا تھا ترقی پسندی نے اسی خواص پرستی کے حصار کو توڑ کر کچھ ایسا برا نہیں کیا، اس نے زندگی کی جوئے کم آب کو بحر کی بے کرانی عطا کی اس نے عوام کے دکھ درد کو سمجھا، سماج کی کھوکھلی قدروں کو بے نقاب کیا، نام نہاد مذہبی دعویداروں کی مذہبی فروشی کو دکھایا، نئے علوم کی آمیزش سے ادب میں ایک نئے دور کا آغاز کیا، زبان و بیان کے تجربے کئے اور جدید اسالیب و صور تراشے - لیکن ان نئے ادیبوں میں بہت سے ادیب ایسے بھی تھے جو ترقی پسندی سے واقف تھے نہ ادب سے. انھوں نے بھی تقلیداً نئی نئی نظمیں لکھیں، - خدا اور مذہب کا مضحکہ اُڑایا حقیقت نگاری اور نفسیاتی گتھی کو سلجھانے کے بہانے ذہنی گندگی کو اُچھالا - ان کی یہ بے راہ روی دیکھ کر پرانے ادیبوں کو بھی موقع ملا اور انھوں نے ایک سرے سے نئے اور ترقی پسند ادیبوں کو بدنام کرنا شروع کر دیا حالانکہ یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ تمام نئے ادیب ترقی پسند نہیں ہیں - ہاں اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اکثر ترقی پسند ادبا کے یہاں بھی بعض بنیادی غلطیاں ملتی ہیں -

وقت کی پکار کو نہ سننے اور خود کو تاریخی تقاضوں کے بموجب مبدل نہ ہونے دینے میں ایک حد تک ہماری مشرقیت بھی کارفرما ہے - ہم یہ نہیں سوچتے کہ آج ہماری مشرقیت ان تمام عناصر سے محروم ہو گئی ہے جو اس کی زندگی اور بالیدگی کا باعث بنے ہوئے تھے اور ہم نے مشرقیت کو نہیں بلکہ محض اس کے فرضی تصور کو سینے سے لگا رکھا ہے - اس کا مطلب یہ نہیں

کہ سرور مشرقیت کے قایل نہیں یا وہ ہمیں محض آنکھیں بند کرکے مغربیت کے سیلاب میں بہہ جانے کا مشورہ دیتے ہیں مگر وہ ہماری بڑھی ہوئی مشرقیت کے ہرگز روادار نہیں۔ اس مشرقیت کے جو اپنی ہر بری چیز کو صرف اس لئے اچھا سمجھتی ہو کہ وہ اس کی اپنی ہے اور مغرب کی اچھی اور مفید شے کو بھی مغربی کہکر نظرانداز کر دینا چاہتی ہے۔ وہ اکبر کی نہیں، اقبال کی مشرقیت کے قایل ہیں جو مغرب کے تجربوں، اس کی علمی قوتوں، اس کی علمی اور ذہنی صلاحیتوں اور اس کی واقعیت پسندی کو اپنانا چاہتی ہے۔ ان کا یہ خیال بالکل بجا ہے کہ ایشیا یا ہندوستان کے ماضی کے کارنامے کتنے ہی شاندار سہی، لیکن ہم ان کا واسطہ دلا دلاکر اپنی پستی کو دور نہیں کر سکتے۔ اس کا بہترین علاج صرف یہ ہے کہ اپنی عقل اور وجدان کے ذریعہ زندگی کے مسایل کو حل کیا جائے اور ضرورت پڑنے پر مغرب کے تجربوں سے بھی فایدہ اُٹھایا جائے۔

آج دنیا اپنی بے کرانی اور فراخی کے باوجود بھی بہت زیادہ وسیع نہیں رہی، کیونکہ نقل و حرکت کے وسایل، ریڈیو اور لاسلکی کی ایجاد اور نت نئے سائنٹفک آلات کی وجہ سے اس کی وسعت تنگی میں اور دوری قرب میں تبدیل ہو گئی ہے اور آج مغرب کی زندگی مشرق کی زندگی سے اور مشرقی زندگی مغربی اثرات سے بے نیاز نہیں رہ سکتی بلکہ ایک دوسرے کی مشکلات، مسایل اور سوچنے کے ڈھنگ بہت کچھ مشابہ ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کے ادراک و شعور میں بڑی حد تک مماثلت پیدا ہو گئی ہے اور وہ مختلف علوم کی مدد سے ایک ہی طرح زندگی کی شب تاریک کو سحر کرنا چاہتے ہیں۔ پھر جبکہ ساری زندگی مشرقی یا مغربی، ایک دوسرے سے متاثر ہو رہی ہو تو ادب ہی کہاں تک قلعہ بندیوں میں محصور رہ سکتا ہے۔ علاوہ ازیں، ادب کے بعض اُصول عالمگیر بھی ہوتے ہیں اور جغرافیائی حد بندیاں ان کی سچائی اور صداقت میں مخل نہیں ہو سکتیں ان اُصولوں اور معیاروں کو ادب میں نہ برتنا، اور ان میں مشرقی یا مغربی، ہندوستانی یا غیر ہندوستانی کی تفریق پیدا کرنا لغو سی بات ہے۔ آخر ہم نے عرب اور ایران کے قواعد اور معیاروں کو بھی تو برتا ہے اور آج تک برت رہے ہیں۔ پھر مغربی اُصول و آداب فن سے منھ موڑنا کہاں کی دانشمندی ہے۔

ہماری ایک بڑی محرومی یہ بھی ہے کہ ہمارے یہاں ادیب صرف ادیب ہیں اور سائنس داں صرف سائنس داں۔ ہمارے شاعر یا ادبا سائنس فلسفہ وغیرہ کی واقفیت ضروری نہیں سمجھتے۔ اسی طرح ان علوم کے ماہرین ادب کو ذہنی تعیش یا شغل بیکاری سمجھتے ہیں، انھیں اس کا احساس نہیں کہ مختلف علوم کی واقفیت سے ان کی نظر میں وسعت اور عقل میں پختگی پیدا ہو گی، زندگی کے نئے نئے حقایق ان پر منکشف ہوں گے، مادیت ان کی تخیلیت کو نئی قوت بخشے گی۔ ٹھوس حقیقتوں کو الٹنے پلٹنے اور جاننے بوجھنے کا مادہ ان میں پیدا ہو گا، اور سائنس کی واقعیت اور خارجیت سے ان کی داخلیت معتدل ہو کر اور بھی دو آتشہ ہو جائے گی۔ اسی طرح ادب، سائنس دانوں کی طبیعت میں ایک نیا لوچ اور نرمی پیدا کر دے گا زندگی اور انسانیت کی نئی قدریں دے گا اور انھیں بتائے گا کہ "بچہ طفلے شود مستانہ می رقص" بھی زندگی میں تنوع، تازگی، عظمت اور حوصلہ پیدا کرنے کے لئے بہت ضروری ہے۔

غزل کو اب پہلی سی مقبولیت حاصل نہیں رہی لیکن افسانہ آج بھی ہماری توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے اور افسانے کی مقبولیت دیکھ کر ایسے لوگ بھی اس کی طرف کھنچ آئے ہیں جن کے مزاج کو افسانے سے کوئی فطری مناسبت نہیں معلوم ہوتی۔ افسانے لکھنا یا افسانے پڑھنا کوئی معیوب بات نہیں۔ یہ بھی ادب کی ایک صنف ہے اور ہماری توجہ کی اسی قدر مستحق ہے جس قدر کہ ادب کے دیگر اصناف۔ افسانے میں زندگی کے کسی ایک پہلو، کسی ایک واقعہ، کسی ایک لمحہ کی عکاسی کی جاتی ہے۔ یہ زندگی کی بوقلمونی اور تفصیل و تعمیر کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے افسانہ نگار عام طور پر اختصار کے عادی ہو جاتے ہیں اور ایک غزل گو کا انتشار ان کی طبیعت میں رچ جاتا ہے۔ سرور غزل کے خلاف نہیں، وہ جوش کی طرح اس کا گلا نہیں گھونٹ دینا چاہتے لیکن اس کی تنگنائے کی وجہ سے ان کا دم ضرور گھٹنے لگتا ہے۔ اس لئے وہ غزل کے ساتھ ساتھ ادب کی دیگر اصناف کی طرف بھی توجہ دلاتے ہیں تاکہ اس میں زندگی کی کشمکش اور رزم و بزم کے وقیع زیادہ وضاحت سے پیش کئے جا سکیں۔

سرور نظم سے زیادہ نثر کی افادیت اور اہمیت کے قایل ہیں لیکن وہ ایسی نثر نہیں چاہتے جو اپنی زندگی کے لئے نظم کی محتاج ہو یا جس کی تابندگی اور درخشندگی نظم کی مرہون منت ہو۔ وہ ابوالکلام کے خطیبانہ اور جذباتی رنگ کے بھی خلاف ہیں اور اسے اُردو ادب کے لئے ایک مستقل خطرہ سمجھتے ہیں۔ اسی طرح آزاد کی جواہر نگاری، شیدا کی رنگین آرائش اور عبدالماجد کی جذباتی رقت آلودگی انھیں کچھ زیادہ نہیں بھاتی۔ اس کے برخلاف وہ سرسید کے سپاٹ اور حالی کے سادہ رنگ سے لوگوں کی عدم دلچسپی کے شاکی ہیں۔ ان کے نزدیک، "اچھے اسلوب میں تلوار کی سی تیزی، بہتے ہوئے پانی کی روانی، آئینہ کی سی صفائی اور ادائے محبوب کی سی دلربائی ہونی چاہیئے" لیکن سوال یہ ہے کہ سرسید یا حالی کے اسلوب میں یہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں اور کیا ابوالکلام آزاد، شیدا، رشید، مجنوں یا خود سرور کا اسلوب حالی کے اسٹایل کے مقابلہ میں زیادہ جاندار، زیادہ ترقی یافتہ رواں اور دلکش نہیں؟ سرسید کی تحریریں تو ادبی اسلوب کی شان ہی نہ تھی۔ حالی کی سادگی پر واقعی ہزاروں رنگینیاں قربان کی جا سکتی ہیں لیکن یہی سادگی بعض جگہ گراں گزرنے لگتی ہے خصوصاً اس وقت جب حالی کی سنجیدگی اور لہجہ کی یکسانیت موقع و محل کی مناسبت کا لحاظ نہیں رکھتی۔ یہاں حالی کے اسلوب سے بحث نہیں صرف اس امر کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ سلاست اور وضاحت (جو حالی کے یہاں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے) کے علاوہ اور خوبیاں بھی جنھیں سرور نے "مسالے کی بھرمار" سے تعبیر کیا ہے، ادبی اسلوب کے لئے بہت ضروری ہیں۔ ہاں ہمیں مواد اور ہیئت کے ربط کو ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہیئے۔

عملی نقاد کی حیثیت سے سرور نسبتاً زیادہ کامیاب نظر آتے ہیں۔ انھوں نے مختلف اصناف ادب، شاعروں اور ادیبوں پر تنقیدیں لکھی ہیں۔ ان میں مبالغہ آمیز تعریف و تحسین کی کوشش کی گئی ہے اور نہ خواہ مخواہ ان کے چیتھڑے بکھیرنے اور خوردہ گیری کرنے کا جذبہ کارفرما ہے۔ سرور کے لہجہ میں عام طور پر نرمی، سنجیدگی، متانت اور شیرینی ملتی ہے

وہ کبھی اپنے آپ سے باہر نہیں ہوتے۔ اور شدید سے شدید اختلاف ہونے پر بھی اپنے حریف کو چیلنج نہیں کرتے بلکہ اسکے نقطۂ نظر کو سمجھنے اور اپنی بات اس کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کرتے۔ "اقبال اور اس کے نکتہ چیں" اور "اردو شاعری میں فانی کی قدر و قیمت" اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ گو فانی پر سرور کا مضمون غیر جانبدارانہ نہیں اور اس میں ان کی حیثیت نقاد سے زیادہ ایک حامی و طرفدار کی ہو گئی ہے۔ لیکن سرور، فانی کی شاعری کی کوتاہیوں سے واقف ہیں اور فانی کی شاعری کی کوتاہیوں سے ان کا انکار (معاصر کے ایک نقاد کے الفاظ میں) اس نئی نویلی دلھن کا انکار ہے جو اقرار کے سوا کچھ اور معنی نہیں رکھتا۔ فانی کی شاعری اور شخصیت پر صحیح لیکن مختصر تبصرہ ان کے ایک مضمون میں ملتا ہے جو "شوکت علی خاں فانی بدایونی" کے عنوان سے ان کی کتاب تنقیدی اشارے میں شایع ہوا ہے۔

پروفیسر حسرت نعمانی نے لکھا ہے کہ سرور ذہین آدمی ہیں۔ لیکن محنتی نہیں معلوم ہوتے یہ رائے سطحی اور یک طرفہ ہے اور ان کی "تنقیدی اشارے" کو دیکھ کر قایم کی گئی ہے۔ تنقیدی اشارے ریڈیائی تقاریر کا مجموعہ ہے اور سرور صاحب کے دیباچہ کے مطابق "ریڈیو سننے والوں کے مذاق اور علم کو ملحوظ رکھکر لکھی گئی ہے۔ اس لئے زبان بہت آسان استعمال کی گئی ہے۔ اور علمی تحقیق کے بجائے پیرایۂ بیان کی دلاویزی پر زیادہ توجہ کی گئی ہے"۔ ان کی تحقیق و تدقیق کا اندازہ کرنے کے لئے "شبلی مری نظر میں"۔ "اقبال اور اس کے نکتہ چیں"۔ "سرسید کے ایک مخالف" اور "اقبال اور ابلیس" کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ یہاں سرور کے تمام مضامین کا جایزہ لینا ممکن نہیں لیکن ان کے مضامین کے سرسری مطالعہ ہی سے ان کی رواداری ان کا خلوص، ان کی میانہ روی، ان کے لب و لہجہ کی نرمی اور شگفتگی، ان کی تحقیق و تدقیق، انکی عدل پسندی اور شاعر کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے۔

سرور موجودہ ترقی پسند ادبی تحریک کی پیداوار نہیں، گو ان کی شہرت کو فروغ اسی زمانہ میں ہوا ہے۔ وہ ترقی پسند بننے سے پہلے پرانے ادب کا مطالعہ ہمدردی اور بالغ نظری سے کر چکے تھے اور اس کی خوبیاں اور کوتاہیاں، ان پر واضح ہو چکی تھیں۔ ہمارے بعض نئے ادیب نئے پن کے جوش میں اور کچھ پرانے ادب سے ناواقفیت کی بنا پر شبلی اور اقبال وغیرہ سے انصاف نہیں کر پاتے اور انھیں ماضی پرست، فاشسٹ، فراری، عینیت پسند اور نہ معلوم کیا کیا الزامات دیتے ہیں۔ سرور نے اپنے مضامین میں ان اعتراضات کی قلعی کھولی ہے اور حالی، اقبال اور شبلی وغیرہ کی ترقی کو واضح کیا ہے اور خصوصاً انکے مضمون "شبلی مری نظر میں" شبلی کی عظمت اور بلند مقامی کو منکشف کرنے میں ان سے متعلق بڑی بڑی تصانیف پر بھاری ہے۔ آج جو ترقی پسند ادیب پرانے ادب کی عظمت اور ترقی کا اعتراف کرنے لگے ہیں اس میں اور ادیبوں کے علاوہ سرور کا بھی ہاتھ ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علی گڈھ کو چھوڑنے کے بعد یا ادھر پچھلے دو تین سال میں سرور کی نئے ادب سے دلچسپی کچھ اور زیادہ گہری ہو گئی ہے اور جو چیزیں پہلے اپنی عریانی بلکہ نحاشی کی وجہ سے انھیں پست اور پُر نظر آتی تھیں اب وہی چیزیں

ان کی نگاہوں میں قدر و منزلت کی مستحق بن گئی ہیں، یہاں صرف ایک مثال کافی ہوگی۔ اپنے مضمون نیا ادبی شعور میں سرور نے لکھا ہے "میں عصمت، منٹو اور اسی قبیل کے افسانہ نگاروں اور میراجی، مخمور جالندھری، مجید بھٹی جیسے شاعروں کو ادب کا پنساری سمجھتا ہوں جو ہلدی کی گانٹھ پر اتراتے ہیں۔" اور اس کے بعد اپنے ایک اور مضمون "موجودہ ادبی مسایل" میں اسی کی تکرار کرتے ہیں — "منٹو، عصمت، میراجی، اور راشد کی آزاد شاعری سب کی سب ترقی پسند نہیں، بہت سے افسانے ترقی پسند ہیں، مگر بو اور لحاف کسی طرح اس ذیل میں نہیں آتے۔" لیکن اس کے بعد ان افسانوں اور افسانہ نگاروں کے متعلق ان کی رائے بدلی ہوئی نظر آتی ہے۔ اپنے مضمون "ترقی پسند تحریک پر ایک نظر" میں لکھتے ہیں "لیکن عصمت اور منٹو کے یہاں، جو عریانی ملتی ہے، وہ سستی عریانی نہیں ہے یہ حیرت انگیز فنی پختگی اور حقیقت نگاری کے اعجاز کی دلیل ہے۔ عصمت کا لحاف ایک اچھا افسانہ ہے۔ منٹو کا افسانہ بو تو نہیں لیکن 'کالی شلوار' بھی ایک شاہکار ہے۔ ان افسانوں کی مخالفت غلط ہے۔"

سمجھ میں نہیں آتا یہ تضاد نقطۂ نظر کی تبدیلی کی بنا پر ہے یا وقتی اور شخصی مصلحتوں کی وجہ سے ہے۔ کیونکہ اسی مضمون میں انھوں نے ترقی پسندوں کے معائب پر اپنی سابقہ جرأت اور دیانتداری سے اظہار خیال کیا ہے جو کسی بدلے ہوئے نقطۂ نظر کی غمازی نہیں کرتا۔

سرور صاحب کی غالباً سب سے اہم خصوصیت جو پہلی ہی نگاہ میں قاری کے دل و دماغ کو متاثر کرتی ہے، ان کا دلنشیں انداز بیان ہے۔ ترقی پسند ادیبوں میں مجنوں گورکھپوری اور اختر انصاری کو چھوڑ کر یہ اسلوب کی یہ دلفریبی اور دل آسائی اور کہیں نہیں ملے گی۔ بلکہ زبان کی یہ سادگی و پرکاری، یہ حلاوت اور لطافت، یہ رنگینی اور بانکپن، یہ لچک اور گھلاوٹ اختر انصاری کے ہاں بھی شاذ ہی ملتی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ سرور اس دور کی پیداوار ہیں جب زبان کو خیال پر ترجیح دی جاتی تھی اور طرز ادا کو ہی سب کچھ سمجھنا چاہتا تھا، مجنوں گورکھپوری اور اختر انصاری بھی ادب برائے ادب کے نظریے کے ماننے والے رہے ہیں اسی لئے الفاظ و اسالیب کی رنگینی و مرصع کاری برابر ان کے یہاں ملتی ہے اسکے برخلاف ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری یا ڈاکٹر عبدالعلیم کے بعض مقالات اپنی خشکی اور بے رنگی کی وجہ سے سیاسی یا اقتصادی مقالات معلوم ہوتے ہیں۔ ان حضرات کی نگاہیں اپنے خیال کی وضاحت اور افادیت سے آگے نہیں بڑھتیں۔ انھیں اس کا احساس باقی نہیں رہتا کہ خیالات میں تاثیر اور گہرائی الفاظ ہی کی وجہ سے آتی ہے۔ جس طرح محض زبان و بیان کی حلاوت یا الفاظ کی میناکاری بغیر خیالات کی صحت یا افادیت کے کوئی معنی نہیں رکھتی اسی طرح پیرایہ بیان کی دل نشینی کے بغیر خیال یا فکر کا دامن بھی تاثیر سے خالی رہتا ہے۔ "مواد اور ہیئت" مجنوں گورکھپوری کے الفاظ میں "ایک ہی راگ کے دو سر ہیں جن باہم متحد اور ایک ہو جانے ہی سے راگ پیدا ہو سکتا ہے اور جن کے بغیر راگ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا سرور صاحب گو ادب میں سب سے زیادہ ادبیت ہی کو ملحوظ رکھتے ہیں لیکن ان کا عقیدہ ہے کہ ادب میں جان

زندگی کے مستحکم اور گہرے تعلق ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح اسلوب بیان کی رعنائی صرف الفاظ کی رنگینی اور فقروں کے برمحل استعمال کی رہین منت نہیں ہوتی۔ اس میں بلندی اور رفعت سچے جذبہ کی آمیزش سے پیدا ہوتی ہے۔ اس میں بے جان اور بے رنگ الفاظ میں جان ڈالنا ہوتا ہے۔ جب جذبہ اصلی اور شدید ہوتا ہے۔ جب اس میں مخصوص اور انفرادی رنگ ہوتا ہے اور جب یہ الفاظ میں اس طرح اُتر آتا ہے گویا ایک دیوتا نیند سے بیدار ہو رہا ہو، اسٹایل اسی کا نام ہے۔ جو شخص اسٹایل کا اتنا بلند تصور رکھتا ہو، اور موضوع اور طرز ادا کے تعلق سے اتنی اچھی طرح واقف ہو، اندازِ بیان کی یہ دل کشی اگر اس کے ہاں بھی نہ ملے تو کہاں ملے گی۔

سرور صاحب کے اسٹایل سے ان کی غیر معمولی قوتِ حافظہ اور صلاحیت انتخاب پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ دوسرے ادیبوں کے سیکڑوں حسین فقرے اپنی پوری آب و تاب سے ان کے یہاں جلوہ فشاں نظر آتے ہیں۔ اسی طرح غالب، حالی، اقبال، فانی اور جگر کے مال سے بھی انھوں نے اپنی دوکان سجائی ہے اور ان کے بیش بہا جواہر پاروں سے سرور کی نثر میں ایک نئی آن بان، ایک نئی عظمت، کچھ نہ کہنے میں بھی سب کچھ کہنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سے حسنِ ادا حسنِ اختصار اور حسنِ معنی تینوں کا حق ادا ہو جاتا ہے۔ سرور صاحب نے غالب، حالی، اقبال اور سجاد انصاری وغیرہ پر جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کے شعور و وجدان کی تشریح اور ان کی شخصیت کی تہیں ہی نہیں کھلتیں بلکہ ان کا طرز فکر اور مخصوص انداز بیان اس قدر نمایاں طور پر اُبھر آتا ہے کہ وہ سرور کے اندر سے خود بولتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں (سرور صاحب کے الفاظ میں) وہ تھوڑی دیر کے لئے اپنا قلم اور زبان ان کو دیدیتے ہیں۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ ان کی ہستی شاعر کی ہستی میں گم ہو کر رہ جاتی ہے یا ان کا مخصوص انداز بیان ان کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے بلکہ اس سے سرور صاحب کو دوچند فایدہ ہوتا ہے یعنی شاعری کا مسیاب ترجمانی کے ساتھ ان کے اسٹایل میں بھی ایک نئی جلد، ایک نئی آب و تاب۔ ایک نئی جادو بیانی پیدا ہو جاتی ہے۔

سرور میں ایک اچھے نقاد کی ساری صلاحیتیں موجود ہیں۔ وہ کافی پڑھے لکھے ہیں، مغرب و مشرق کے ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں، ادب اور زندگی کے رشتہ سے واقف ہیں۔ فرد اور سماج، اسلوب اور مواد، ماحول اور شخصیت، ادب اور پروپیگنڈے کے تعلقات سے واقف ہیں۔ وہ نہ طرز کہن پر اڑتے ہیں اور نہ آئین نو سے ڈرتے ہیں۔ آتی ہوئی دنیا اور جاتی ہوئی دُنیا دونوں پر ان کی نظر ہے۔ وہ عریانی اور فحاشی کے فرق سے آشنا ہیں۔ عریانی کب ایک ضرورت اور کب ایک بیماری بن جاتی ہے وہ اس سے بھی بے خبر نہیں۔ ان کے اسلوب میں جان، شگفتگی اور رعنائی ہے۔ وہ تشریح و تجزیہ اور ترجمانی کی حتی الامکان کوشش کرتے ہیں۔ وہ نئے تجربوں سے بدکتے نہیں، انھیں پرکھتے ہیں اور قدروں کی اشاعت اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ان کے فیصلوں میں وزن اور اعتدال ہے۔ اُردو کو ان سے بڑی توقعات ہیں۔

محمد عظیم

یہ انسان ہے؟

... اور جب خون کی ایک پتلی اور گرم دھار اس کے چہرے پر پڑی تو وہ سوچنے لگا - "ہندوستان جل رہا ہے، ہر جگہ آگ اور خون کا کھیل جاری ہے - بدیشی راج سودیشی راج میں تبدیل ہوا اور فوراً ہی ہندوستان کا نظام موت کی سرد انگلیوں کی گرفت میں کانپنے لگا - ۱۵ اگست کو ہندوستان نے دو صدیوں کا بوجھ اپنے شانوں پر سے اُتار پھینکا - مگر شانوں کے ہلکے ہونے پر بفکری کی جو پہلی سانس ہندوستان کے لاتعداد انسانوں نے لی وہ آزادی کی جنت پر جہنمی ضرب ثابت ہوئی - غلام ذہنیتیں، پست دماغ، آزادی کے نورانی چہرے کی تاب نہ لاسکے - نگاہیں چکا چوند ہوگئیں اور دل گمراہ - ۱۵ اگست کو رات کے بارہ بجے بدیشی سامراج نے اپنی آخری ہچکی پوری کی اور اس کے بعد ہی غلام ہندوستان میں اس آزادی کا ردعمل شروع ہوگیا - اس وقت خوشی کے بے شمار نعرے ہندوستان اور پاکستان کی راجدھانیوں میں سنائی دے رہے تھے ٹھیک اسی وقت تعصب درندگی اور بہیمگی کی آگ بھی سلگائی جارہی تھی - آزادی کا پہلا سورج ہندوستان میں طلوع ہوا اور آپس کے آئینی اختلافات خونریز سفاکیوں میں تبدیل ہوگئے جس قوت کو اُبھارنے میں لاتعداد زندہ دماغوں نے متواتر چوبیس سال صرف کر دئے تھے جن جذبات کو اُبھارنے کے لئے بیشمار زبانیں مسلسل چھ سال سے چل رہی تھیں اس کو کسی نہ کسی جگہ صرف ہونا ہی تھا - جن جذبات اور جن خیالات کو بدیشی سامراج کے مقابلہ کیلئے اُبھارا گیا تھا وہ آپس ہی میں ٹکرا گئے - جس مواد کو برسہا برس کی پیہم اور متواتر کوششوں سے پکایا گیا تھا وہ خود بخود پھوٹ گیا - لیکن دلوں کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے جو اقدام کیا گیا تھا غلط روی کی وجہ سے وہ زیادہ بھاری محسوس ہونے لگا اور ہندوستان کے لاکھوں انسان بھیڑیوں کے پیکر میں تبدیل ہوگئے -

سامنے ہی ستیش کی لاش خاک و خون میں لتھڑی پڑی ہوئی تھی اس کا گرم اور گاڑھا خون سڑک پر جمنے کے قریب تھا، لیکن گرد اور خون سے لتھڑے ہوئے چہرہ پر ایک پُرسکون مسکراہٹ بھی نظر آتی تھی - کپڑوں کی سلوٹیں - سڑک کے نشان ہاتھوں اور گھٹنوں کے انداز شاہد تھے کہ مرنے والا مرنے سے پہلے تڑپا بھی تھا -

قرب و جوار کا ماحول بڑا قیامت آفرین تھا، ہر طرف دھوئیں کے بادل اور آگ کے شعلے دکھائی دیتے تھے وحشتناک چیخیں، دبی ہوئی کراہیں، عورتوں کا سسکنا محشرستان کا نمونہ پیش کر رہا تھا - انسانوں کی لاشیں کس مپرسی کی حالت میں کتوں کی طرح زمین پر پڑی ہوئی تھیں - جنت نگار ہندوستان جہنم میں تبدیل ہوگیا تھا، ہر طرف ہنگامہ دار و گیر گرم تھا

وحشت ناک کراہیں تھیں اور دبی ہوئی سسکیاں - اسی محشر دار و گیر میں کبھی کبھی خوشی سے معمور نعرے بھی سنائی دیجاتے ست سری کال - جے ہند - پاکستان زندہ باد - غنڈوں کے غول جن کے چہروں پر خشونت اور آنکھوں میں درندگی کی چمک کھیل رہی تھی ادھر سے اُدھر دوڑتے دکھائی دیتے تھے، ہر ایک کے سامنے قتل و غارت گری کے علاوہ دوسرا مقصد نہیں تھا - ہر ایک کے سامنے ایک ہی سوال تھا - مسلمانوں کو مٹا دو، ہندوؤں کو تہس نہس کر دو - سکھ قوم کا نشان نہ رہنے پائے - ان کے نزدیک کسی معصوم کا یتیم ہونا، کسی عورت کا بیوہ ہونا، کسی خاندان کا برباد ہو جانا کوئی بات نہیں تھی وہ اپنے نزدیک اسی بات کو عالمِ انسانیت پر ایک احسان تصور کر رہے تھے کہ وہ خود قتل و غارت گری میں شریک نہیں تھے بلکہ دور ہی سے جلتے ہوئے گھروں، اجڑتے سہاگوں اور معصوم چیخوں کا نظارہ کر رہے تھے - جن آنکھوں کو انسانیت کی موت پر اشک ریز ہونا تھا وہ خوشی سے چمک رہی تھیں - جس دل کو انسانیت کے لئے رو پڑنا چاہئے تھا وہ بدامنی پر خوش ہو رہا تھا - جن زبانوں کو امن و انسانیت کی تعمیر کے لئے وقف ہونا تھا وہ تعصب کی وجہ سے گنگ ہو گئی تھیں - جس طاقت کو بدامنی، خانہ جنگی اور خونریزی کو جڑ سے اُکھاڑ دینے کے لئے صرف ہونا تھا وہ امن کو برباد کرنے میں صرف ہو رہی تھی -

۱۵ر اگست کو ہندوستان آزاد ہوا اور دوسرے ہی لمحے میں اس غلام آباد کا ہر باشندہ انسانیت - تہذیب - شرافت - مروت - اخلاق اور لحاظ سے بھی یک قلم آزاد ہو گیا - وہ دل جن میں کبھی انسانیت اور اخلاق کی شراب چھلکتی تھی، اب زہر ہلاہل سے لبریز تھے - ہر ایک کے دماغ کو - دل کو - زبان کو - روح کو تعصب اور درندگی کا گھن لگ گیا تھا - انسانیت کی چیخیں - امن کی سسکیاں - معصوموں کی کراہیں ان کے کانوں میں پہونچتیں لیکن وہ بالکل بے حس تھے - ہر ایک کے سامنے جلے ہوئے کھیت - اُجڑے ہوئے مکانات تھے، لیکن انسانیت کے احساس کے بجائے ان کے دل تعصبانہ خوشی سے معمور تھے - چالیس کروڑ آدمیوں کے پاس نہ اپنا دماغ تھا نہ اپنی زبان - وہ جو کچھ بھی سمجھتے تعصب کے پردوں سے، اور جو کچھ بھی بولتے نفرت اس کے پس منظر سے جھانکتی ہوتی نفرت - حقارت - بدامنی - سفاکی قتل اور غارت گری کی ایک ہی لہر تھی جو چالیس کروڑ انسانوں کے دماغوں - دلوں اور روحوں تک میں سرایت کر گئی تھی - ہر متنفس اُداس تھا اور ہر شخص پریشان - کسی کو بھی خبر نہیں تھی کہ دوسرے منٹ میں کیا ہونے والا ہے - اب سے چند ہی ماہ پہلے کا انسان موت سے بے فکر - انجام سے بے پروا بے فکری اور عیش کی داد دینے میں مصروف تھا اور اب جہاں موت کی گرم بازاری تھی وہاں لوگ کیڑے مکوڑوں کی طرح مر رہے تھے، مکان جلائے جا رہے تھے دوکانیں لُٹ رہی تھیں - عورتوں کی عفت - ان کا سہاگ ان کے بچے سب کے سب خطرے میں تھے بھارت ماتا خون کے آنسو رو رہی تھی اور اس کے فرزند امن کی تار تگری اور انسانیت کشی میں مصروف تھے، ان انسان نادرندوں میں ہندو بھی تھے، مسلمان بھی، سکھ بھی اور یہ عجیب بات تھی کہ جہاں اختلافات کی لعنتوں سے ان کے سینے ملوث تھے جہاں اختلافات کے پردوں میں سکھ مسلمان - ہندو ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے تھے وہاں لوٹ مار میں ان سب قوموں کا اشتراک عمل تھا - اس غارت گری کے وقت ان کے ناپاک سینے اس چیز سے نہیں پھٹ جاتے تھے کہ

اس لوٹ مار کا ہدف ہندو ہے یا مسلمان۔ سکھ ہے یا عیسائی۔ اس وقت ان کا تعصب۔ ان کی نفرت۔ حقارت نہ معلوم کہاں غائب ہو جاتی۔ ہر شخص پریشانیوں کے ہجوم میں گھرا ہوا تھا۔ موت اور زندگی کا ٹکراؤ ہر آن سامنے تھا حیات کے ہر ایک گوشے سے موت کا ہیبت ناک چہرہ لے آگے بڑھتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ جہاں جہاں اس آگ کی لپٹیں ابھی تک نہیں پہونچی تھیں وہاں بھی لوگ خایف تھے۔ ہر وقت ایک نامعلوم خوف سے ان کے دل سینوں میں لرزتے رہتے۔ کل کیا ہوگا؟ یہ کسی کو بھی معلوم نہیں تھا۔ نوزائیدہ حکومتیں اپنی اپنی بساط کے موافق اس غارت گری اور سفاکی کو روکنے میں مصروف تھیں لیکن بیکار۔

عوامی تحریک گورنمنٹ کے چند کل پرزوں سے نہیں دبائی جا سکتی۔ یہ آج ہی کا نہیں مہذب دنیا کا نہایت ہی پرانا تجربہ ہے جو ہر وقت اور ہر زمانہ میں کامیاب تھا اور ہے۔۔۔۔ نہ عوامی آواز دبائی جا سکتی ہے اور نہ عوامی تحریک کو طاقت سے کچلا جا سکتا ہے۔" امن تو جب ہی ممکن ہوگا جب جنتا کا ہر فرد۔ قوم کا ہر متنفس امن چاہے۔ مکان کو چند ہی گھنٹوں میں گرایا جا سکتا ہے لیکن باقاعدہ اور از سر نو تعمیر کرنے میں مہینوں صرف ہو جاتے ہیں اور بہت سے مکانوں کو تو انہدام کے بعد تعمیر بھی نصیب نہیں ہوتی۔ امن کے لئے سچی تڑپ، صادق امنگ اور پاک آرزوؤں کی جتنی ضرورت ہے اتنی عظیم ارادوں اور عالی شان اقدام کی نہیں۔۔۔ امن کمیٹیوں کے نہ معلوم کتنے اراکین پر کتنے بے گناہوں کا قصاص واجب ہے۔

دار و گیر کا ہنگامہ تیز تر ہوتا گیا۔ سامنے ہی ایک مشتعل ہجوم کسی نئے ہدف کو ذبح کرنے کی کوشش میں مصروف تھا، ننھے ننھے بچوں کی روحوں پر ظلم اور ستم کی جو ضربیں پڑ رہی تھیں اس کی وجہ سے ان کے معصوم چہرے بالکل سفید پڑ گئے تھے، ماؤں کے سینے لرز رہے تھے اور چہرے بالکل پھیکے۔ نوجوانوں کی زوجان امنگیں انھیں مدافعت کے لئے ابھار رہی تھیں لیکن حملہ آور ہجوم کے اسلحہ اور سامان غارت گری کی زیادتی مصلحت بنکر ان کے آڑے آ رہی تھی۔ اپنے آپ کو بے بس پاکر جو جھنجھلاہٹ ہر ایسے وقت میں انسان کے دل میں پیدا ہوتی ہے ان کے تمتماتے چہروں سے صاف نمایاں تھی۔ سامنے ہی ایک شخص ڈر اور خوف کی وجہ سے بند دروازے میں گھس پڑنے کی ناکام کوشش میں اس کا منھ خوف اور دہشت سے ہیبت ناک طور پر کھل گیا تھا۔ آنکھوں میں جو دہشت سرایت کر گئی تھی اس کی وجہ سے اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر نکلی پڑتی تھیں۔ مشتعل ہجوم کی ایک ٹکڑی نے اس کو اس حالت میں دیکھا۔ ہیئت کذائی۔ مجبوری اور بے بسی پر رحم آنے کے بجائے ان کے دل نفرت اور حقارت سے لبریز ہو گئے۔ ایک دھار دار آلہ اسکے پہلو میں اتار دی گئی اور چشم زدن میں وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ جہاں اس کے خون نے بہہ بہہ کر نالی کے پانی کو دور دور تک رنگین بنا دیا۔ اس واقعہ کے فوراً ہی بعد قتل و غارتگری اور سفاکی کا یہ ہنگامہ تیز تر ہو گیا۔ جہاں کہیں آبادیاں تھیں کھنڈر نظر آنے لگے، آدمی کو آدمی کی پہچان باپ کو بیٹے کی شناخت باقی نہ رہی ہر شخص کو اپنی جان اور آبرو کی فکر لاحق تھی۔ یہ قیامت خیز منظر تھوڑی ہی دیر باقی رہا۔ جب یہ ہنگامہ ٹھنڈا پڑا تو سوا تڑپتی لاشوں کے کچھ بھی باقی نہ رہا۔ شعلے بلند ہوئے اور چشم زدن میں ہر طرف جہنم ہی جہنم دکھائی دینے لگا، اور

مُردہ لاشیں، نیم مردہ جسم، زندہ عورتیں، زخمی بچے سب اس آگ کی نذر کر دئے گئے، گوشت کے جلنے کی سڑاند سے دماغ پھٹنے لگے اور یہ غول بیابانی اس عفونت کی تاب نہ لاکر مال غنیمت سے لدا پھندا دوسری راہ سے کسی اور مظلوم بستی کو اُجاڑنے روانہ ہوگیا۔

اس نے ان سب مناظر کو دیکھا۔ اور اس کا دل کانپ گیا وہ حیران و پریشان وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا۔ سامنے ہی اس کے دوست کی لاش کس مپرسی کے عالم میں پڑی ہوئی تھی۔ اسے ستیش کی زندگی اس کی لاش پر سے گزرتی دکھائی دے رہی تھی اور وہ اس کے چہرے پر نظر جمائے اس کی زندگی کے مختلف مناظر کی سیر کر رہا تھا۔ ستیش سے دوستی کی ابتدا۔ اسکی شریفانہ طبیعت، پھر اسکی پدما سے محبت، محبت میں بے تابی، پدما کی کج ادائی کے قصے، ستیش کی پریشانی، پھر پدما کا اسکی طرف کھنچنا، ستیش سے لگاوٹ، گاؤں کا ماحول، ماں باپ کی فکر، پدما کے گھرانے میں پیغام، وہاں سے منظوری، ستیش کی معصوم خوشی، پدما کے جذبات، شادی کا اقرار۔ تاریخ کا تعین ہنگاموں کی ابتدا یہ سب مناظر اس کی نگاہوں کے سامنے آگئے، ایک سرد سانس اس کے سینے سے نکلی اور ستیش کے یہ الفاظ اس کو یاد آگئے ... "میں شادی نہیں کروں گا ماں ..... ہندوستان جہنم بن گیا ہے ہزاروں آدمی روزانہ قتل ہو جاتے ہیں لاکھوں عورتیں روزانہ بیوہ ہو جاتی ہیں، کتنے ہی گھر آج کھنڈر نظر آرہے ہیں۔ ہزاروں کھیت اُجڑے پڑے ہیں، ایسی حالت میں شادی نہیں کر سکتا؟ مجھے شادی کے لئے مجبور نہ کرو۔ مجھے جانے دو۔ مجھے انسانیت پر بھینٹ دیدو ماں ..؟ زندگی ہر طرف سے خطروں میں گھر جائے... موت کا خوف ہر طرف مسلط ہو۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے؟ اس سے تو موت کہیں بہتر ہے۔ خدا کے لئے مجھے اجازت دیدو۔ ماں؟ پھر ماں کا انکار۔ ستیش کا اصرار اور ماں کے یہ الفاظ بھی اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔ "ستیش؟ تو میری اکلوتی اولاد ہے اگر خدانخواستہ .....؟"۔ "خدانخواستہ کیا ماں؟ صاف کہو اگر میں مرگیا تو تمھیں دُکھ ہوگا۔ تکلیف ہوگی۔ سنو ماں۔ آج ہزاروں آدمی مر رہے ہیں۔ لاکھوں عورتیں سسک رہی ہیں سیکڑوں اولادوں کے آنسو نہیں تھمتے۔ تو کیا ان کے ماں نہیں۔ باپ نہیں۔ مامتا نہیں۔ کیا نہیں؟ سب کچھ ہے۔ لیکن وہ مر رہے ہیں اور اس مرنے سے انھیں خدا کی طاقت۔ باپ کی محبت۔ ماں کی مامتا۔ کوئی نہیں روک سکتی۔ وہ مر رہے ہیں چیونٹیوں کی طرح پس کر۔ کچلے جاکر۔ یونہی بلا مقصد۔ بے ارادہ۔ مظلوم۔ بے کس۔ ان کے سامنے کوئی مقصد نہیں ہوتا جس پر وہ جان دیدیں۔ کوئی منزل نہیں ہوتی جو ان کو مرنے کا غم نہ ہو۔ اور تمھیں تو خوش ہونا چاہئے ماں؟ کہ اگر تمھارا بیٹا مرے گا بھی تو اس کے سامنے ایک پاک مقصد ہوگا۔ ایک سچی تڑپ۔ ایک نیک ارادہ۔ مستحکم منزل اور بلند نصب العین۔ میرے جیسی قربانیاں جب تک اس دیش کے لئے نہیں ہوں گی ہندوستان میں امن نہیں ہو سکتا۔ اگر میں مر بھی گیا تو میری موت ہندوستان کیلئے باعث افتخار ہوگی اور انسانیت کے لئے باعث مسرت ...

پھر ماں کی اجازت۔ ستیش کی رخصت۔ ماں کے آنسو ستیش کی مسکراہٹ۔ پدما سے ملاقات۔ پھر اسکی

سسکیاں۔ ستیش کا سمجھانا۔ پدما کا مچلنا اس کی پتلیوں میں کانپنے لگا۔ پھر غنڈوں سے ٹکراؤ۔ ستیش کی تقریریں مشتعل صدائیں۔ گندی گالیاں۔ ستیش کا سمجھانا، سینمائی تصاویر کی طرح رقص کرنے لگا۔ ستیش کی مسلسل کوششیں پھر باہر سے آئے ہوئے ایجنٹوں سے بچنا۔ ان کا ایک دم بھڑک اٹھنا۔ ستیش کا اپنے آپ کو پیش کر دینا۔ غنڈوں کا پس و پیش۔ پھر یکایک کسی ریوالور کی آواز۔ ستیش کا گرنا اور مسکراتے ہوئے تڑپنا، اس کے دماغ پر مرتسم ہو گیا۔۔۔ اسکے بعد۔۔۔ افکار و پریشانیوں کے ہجوم جلی ہوئی لاشوں کی دماغ سوز عفونت سے اس کا سر پھٹنے لگا اور نہ معلوم کس وقت وہ ستیش کی لاش پر بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ جب اس کو ہوش آیا تو دھوئیں کے بادل چھٹ گئے تھے۔ مکان اور کھیتیاں راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو گئی تھیں فضا میں ہولناک سکوت طاری تھا۔ کبھی کبھی لاشوں کی بچی کھچی ہڈیاں چٹخ جاتیں اور ان کے چٹخنے سے ان کے اوپر کی راکھ اڑ کر دور جا گرتی۔ اس نے ستیش کی نعش کا الوداعی بوسہ لیا اور پھر بولا "ستیش۔۔۔۔؟ میرے دوست۔۔۔۔؟ تمہارا شاہد تم سے رخصت ہوتا ہے اور اس عزم کے ساتھ کہ جو پاک مقصد اور بلند نصب العین تمہاری ناگہانی موت سے تشنۂ تکمیل رہ گیا ہے اسے پورا کر دے۔ دعا کرو یا تو وہ اپنے ارادہ میں کامیاب ہو اور یا موت اسے اپنے آغوش لیکر تم سے ملا دے۔۔۔ اچھا رخصت۔۔۔۔ دعا کرتے رہنا بھائی۔۔۔۔؟ اشکوں کی دھار اس کی آنکھوں سے بہ نکلی وہ روانہ ہو گیا ایک سمت کو اس حالت میں کہ قدم لڑکھڑا رہے تھے اور دماغ بوجھل۔ آنکھیں جل رہی تھیں اور دل رو رہا تھا لیکن روح میں وہ مستحکم ارادہ تھا جو نہ لچک سکتا تھا نہ ٹوٹ سکتا تھا۔ وہ چل دیا حیات اور موت سے بے نیاز۔ مشکل اور آسانیوں سے لاپروا۔ وہ ہر ایسے ہجوم میں گھس گیا جہاں قدم قدم پر موت سے تصادم ناگزیر تھا۔ وہ ہر ایسے غول سے بھڑ گیا جن کے سامنے زندگیاں دم توڑ رہی تھیں۔ بہت سے مشتعل ہجوموں کو اس نے اپنی بے ریا کوششوں سے ٹھنڈا کر دیا۔ ہر طرف اس کی سچی کوششوں نے امن و سلامتی کا ڈنکہ بجوا دیا۔ اور جب انسان نما درندوں کا ایک ہجوم ایک مندر کو آگ لگانے کی کوشش میں مصروف تھا تو وہ ان کے آڑے آیا۔ اس نے ان کو سمجھایا تعصب کے دماغوں سے نہیں انسانیت کے دماغوں سے اپیل کی۔ گڑگڑایا۔ مدافعت کی لیکن بیکار، اور جب ایک مسلمان ہی کے ہاتھ سے وہ سچا مسلمان موت سے ہم کنار ہوا تو اس کے چہرے پر ستیش سے ملنے اور مقصد کی بلندی کی پاک مسکراہٹ کھیل رہی تھی خوشی کے بیشمار نعروں کے درمیان جب اس نے دم توڑا تو اس کو انسانیت کا درس اپنے لئے کشادہ دکھائی دیا اور فطرت کی لطیف مسکراہٹوں نے اس کے سکرات موت کو سہل کرتے ہوئے اس کا استقبال کیا۔

جمیل مہدی

نگار کا (جوبلی) پاکستان نمبر

اگر آپ نے نہیں دیکھا تو اب طلب فرما لیجئے، حضرت نیاز کے علمی و تاریخی مقالات کا مجموعہ

حجم ۴۰۰ صفحات قیمت تین روپیہ - خریداران نگار سے ۲ر۸ر

منیجر۔

نوروز اور مینا بازار

اہلِ لغت لکھتے ہیں کہ نوروز ایرانیوں کے سال کا پہلا دن، یعنی فروردین مہینہ کا پہلا دن ہوتا ہے۔ جب آفتاب برجِ حمل کے پہلے نقطہ میں پہونچتا ہے۔ اسی مہینے سے اہل فارس کا سال شروع ہوتا ہے۔ ہندوستان میں اس کا زمانہ تقریباً بیساکھ سمجھا جاتا ہے[1]۔

فارسی شعرا نے نوروز پر طرح طرح کے رنگین قصاید لکھے اور اپنے کمال اور جودتِ طبع کی یادگار چھوڑی ہیں ایک مطلع[2] سن لیجئے:

آمد نوروز ماہ باگل سوری بہم — بادۂ سوری بگیر بر گلِ سوری نجم[3]

شیخ الشعرا حضرت سعدی فرماتے ہیں:

عظمِ دولت نوروز بہ صحرا برخاست — لشکر زحمتِ سرما ز سرما برخاست

ظہیر الدین محمد بابر بھی اس کو یاد کر لیتا ہے:

نوروز و نوبہار مئے دلبراں خوش است — بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

نوروز دنیا کا سب سے پرانا اور کم و بیش تمام اقوام و ممالک میں رائج اور اہم تیوہار مانا جاتا ہے۔ ایرانیوں اور ان کے ہمسایہ مغلوں اور تاتاریوں وغیرہ میں اس کا بڑا دور دورہ تھا۔ وہ اس کو اس شان اور آن بان سے مناتے تھے کہ اقوامِ عالم کی کوئی اور قوم ان کی برابری نہیں کر سکتی تھی۔ آج کل بھی ایران میں سب سے بڑا قومی تیوہار نوروز ہی پایا جاتا اور تیرہ دن منایا جاتا ہے۔ اس کے بانی کے متعلق روایات کا اختلاف ہے۔ اکثر مورخ اس کا بانی جمشید کو لکھتے ہیں جو حقیقتاً ایک داستانی یا افسانوی شخص بتایا جاتا ہے۔ نوروز کی ابتدا اور دستورات کے متعلق مستقل کتابیں بھی موجود ہیں۔ ان میں اضافہ بھی ہوتا رہتا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر اقبال کی عالمانہ تلاش و تحقیق سے ہم کو بہت سے حوالے اور

---

[1] برہان، رشیدی، سروری، غیاث - مدار - [2] صفحہ ۴۶، عدد ۶۸، اورینٹل کالج میگزین - [3] سوری - سین پر پیش اور واؤ معروف - کئی معنی ہیں - ایک پھول کا نام ہے جو سرخ رنگ ہوتا ہے - بلکہ ہر پھول اور لالہ کو جو سُرخ رنگ ہو سوری کہتے ہیں، سور کے لفظی معنی سرخ کے ہوتے ہیں نیز جشن شادی، عروسی وغیرہ کچھ ایسے معنی بھی ہیں جو پوربی زبان کے ساتھ مخصوص ہیں - ایک قسم کا پکوان (دانی) بھی سوری کہلاتا ہے - از جہانگیری، رشیدی، منتخب -

تذکرے ملے ہیں۔ ایک معتبر کتاب "نوروز نامہ" کا پتہ چلا ہے جو یقیناً فارسی کی قدیم ترین کتابوں میں سے ہے۔ فردوسی نے شاہ نامہ میں بھی نوروز کے بارہ میں جا بجا لکھا ہے۔ البیرونی نے آثار الباقیہ میں اس کی وضاحت فرمائی ہے۔ جرمن فاضل پروفیسر مارکوآرٹ کا مقالہ نہایت لائق قدر اور قابل استفادہ ہے۔ فرانسیسی مورخین اور انشا پردازوں نے بھی خامہ فرسائی کی ہے، جو لایق تحسین ہے۔

عرب کا نامور شاعر مہیار دیلمی[1] اپنی زبان میں نیز ایران و عجم کے بہت سے قادر الکلام باکمال سخنور، فرغی، عنصری، منوچہری وغیرہ فارسی میں نوروز کے متعلق نئے نئے مضمون اپنے مدحیہ قصاید میں لکھ گئے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ساسانیوں کا محبوب سرکاری مذہب زرتشتی ہوگیا تھا۔ زرتشتی مذہب والے اپنے عقاید کے مطابق اس دن کو "یوم اموات" کہتے تھے اور ان ایام میں دخمول یعنی برجِ اموات پر کھانا یا گھروں کی چھتوں پر مُردوں کی روحوں کے لئے پرتکلف کھانوں کے خوان رکھوا دیتے تھے۔

اس لئے ان کے زمانہ میں عیدِ نوروز کی حیثیت ایک درباری جشن یا ملکی تقریب سے زیادہ مذہبی شان و عظمت رکھتی تھی اور وہ بڑے پیمانہ پر نہایت تزک و احتشام سے منایا جاتا تھا۔ عباسی خلفا نے عجمیوں کے تخت اور اُن کے قلمرو پر قبضہ پایا تو ساسانیوں کے جملہ مراسم و روایات کو قایم رکھا۔ اسی ذیل میں نوروز کا جشن بھی برقرار رہا۔ زرتشتی دین میں زراعت و کاشتکاری و فلاحی کو ایک فریضۂ مذہبی قرار دیا گیا ہے وہاں کاشتکاری کا کاروبار نوروز ہی سے شروع ہوتا تھا یہ قدرت کے بہترین عطیہ یعنی موسم بہار کی آمد کی خوشی میں منایا جاتا تھا۔ اور اہل ایران کے سال شمسی کے آغاز سے وابستہ تھا۔ اس جشن کا وقت ماہ مارچ میں مقرر تھا جب رات اور دن موقع اعتدال پر پہنچتے ہیں تقویم اسلامی کی رو سے اُس کی تاریخ ایک ہزار برس سے ۲۱ مارچ چلی آتی ہے۔ صدیوں تک یعنی جلال الدین ملک شاہ سلجوقی کے عہد تک نوروز کا زمانہ برابر بدلتا رہا ہے۔ اس نے اصفہان میں رصدگاہ بنوائی، تقویم ایرانی کی تجدید کی تقویم جلالی ایجاد و مرتب کی، جو تقویم ملک شاہی بھی کہلاتی ہے اور جس کے حالات ڈاکٹر ہائیڈنگ نے تفصیل لکھے ہیں تو ہمیشہ کے لئے ۲۱ مارچ معین کردی گئی ۴۶۵ھ (۱۰۷۳ء) میں خلیفہ وقت[2] نے جشن نوروز کا منایا جانا ممنوع قرار دیا لیکن لوگ باز نہ آئے حتیٰ کہ چودھویں صدی مسیحی کے آخر میں سلطان یرقوق نے اس کا کلیۃً خاتمہ کر دیا۔ اوپر لکھ چکا ہوں

---

[1] ہجرت کی چوتھی صدی کے آخر اور پانچویں صدی کے شروع میں گزرا ہے۔ عرب کے اس نامور شاعر و کاتب کا سال وفات ۴۲۱ھ قرار پایا ہے۔ پہلے مجوسی تھا۔ محمد شریف رضی بن حسین بغدادی کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوا تھا۔ ابوالحسین مہیار بن مرزویہ فارسی کے نام سے تذکروں میں یاد کیا گیا ہے۔ مہیار کا دیوان پوری صحت اور اہتمام کے ساتھ بیروت میں چھپا ہے۔

[2] الطائع للہ ابوبکر۔ ؟ ذی القعدہ ۳۶۳ھ جولائی ۹۷۴ء میں مسند آرائے خلافت ہوا تھا۔

کہ پرانے لغت نویس نوروز کو ماہ فروردین کا پہلا دن لکھتے تھے کہ جب آفتاب برج حمل سے نقطہ اول پر پہونچتا ہے اور چھ دن یعنی پہلی سے چھٹی تک منایا جاتا ہے۔ ہمارے ہندوستانی حساب سے اس کا وقت بیساکھ کے قریب ہوتا ہے جو بہار کا آغاز سمجھا جاتا ہے[1]۔

ولایات عجم میں بہار کی ابتدا اسی مہینہ (بیساکھ) سے ہوتی ہے۔ اس اختلاف کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ ایران میں موسم سرما بہت طویل اور شدید ہوتا ہے۔ بمبئی اور اس کے اطراف کی تینوں پارسی جماعتیں نوروز مناتی ہیں مگر کسی بڑے پیمانہ و طریقہ پر بڑے اہتمام سے نہیں کرتیں۔ ترکستان (طرفان) ایران، مصر میں بھی یہ رسم دیکھی جاتی ہے اور تقریباً وہی تمام باتیں وہاں بھی رائج ہیں جو ہمارے ہندوستان میں ہولی کے موقع اور تہوار پر منائی جاتی ہیں اچھے لباس پہننا، گانا بجانا، رنگ پاشی، معانقہ، پانی پھینکنا پچکاریاں چلانا، چہروں پر آٹا اور چونا مل کر گدھوں پر سوار کرانا، بازاروں میں مٹرگشت، جنسی مذاق اور جہالت کی جتنی حرکتیں ہوتی ہیں سب ہی رائج و جائج ہیں۔ اور وہاں کا جواز بھی اور ملکوں کے رواج کی طرح قانون کا اثر اور حیثیت رکھتا ہے۔

مغلوں[2] کے دور میں اکبر نے نوروز کو ایک باقاعدہ تہوار قرار دیا۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں توضیح کی ہے چونکہ بادشاہ سلامت آفتاب کی پرستش کے قائل تھے، لہذا انھوں نے نوروز جلالی کو ایک مقدس تہوار تسلیم کیا۔ بدایونی نے بھی اس کی تصدیق کی ہے اور لکھا ہے کہ نوروز مسلسل انیس روز تک منایا جاتا تھا یعنی یکم فروردین سے ۱۹ فروردین تک۔ انیسواں دن "روزِ شرف" کہلاتا تھا اور سب سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ آگرہ کے بازاروں میں آئین بندی ہوتی تھی اور محلات شاہی، دیوانِ عام اور دیوانِ خاص کو سجایا جاتا تھا۔ قیمتی پردے آویزاں کئے جاتے تھے۔ بیش بہا قالین بچھائے جاتے تھے اور دربار عام ہوتا تھا۔ سنہ ۹۹۰ھ میں[3] جشن نوروز کی کیفیت کو بدایونی نے بالفاظ ذیل لکھا ہے:-

"دیا تو دہم شہر صفر ایں سال (سنہ ۹۹۰ھ) تحویل نوروز و شروع در سال بست و ہشتم از جلوس روی داد، آئین بندی ہر دو دیوان خانۂ خاص و عام بانواع قماش ہائے لطیف فرمودہ اشیائے قیمتی گوناگوں ترتیب نمودہ و پردہ ہائے فرنگی و تصویر ہائے بے نظیر گرفتند و سرایردہ ہائے اعلیٰ افراشتند و بازار آگرہ و فتحپور را نیز بایں دستور آراستہ تا شیردہ روز و شب جشنِ عالی داشتند و اقسام طوایف اہلِ نغمہ و ساز ہندی و فارسی و ارباب طرب از مرد و زن ہزاراں ہزار طلبیدہ ہر روز در ایوانِ یکے از اُمرائے نامدار آمدہ و صحبت داشتہ پیشکشِ معتبر و اسباب مہانی از وے گرفتند۔[4]"

---

[1] مثنوی میر عبدالجلیل بلگرامی صفحہ ۱۲۔ حاشیۂ دوم، مطبوعہ نول کشور سنہ ۱۲۹۹ھ۔ [2] منقول، صفحات ۱۴ و ۱۵، اور میٹل کاج میگزین، نمبر ۶۲ بابت اگست سنہ ۱۹۳۰ء۔ [3] مطابق سنہ ۱۵۸۶ء۔ [4] صفحہ ۲۳۸۔ از طبع نول کشور۔

شاہانِ مغلیہ اپنے سالِ جلوس کی ابتدا نوروز کے دن سے شمار کرتے تھے۔ جہانگیر اپنی توزوک میں ہر نئے سال کے واقعات کو جشن نوروز کی کیفیت سے شروع کرتا ہے۔ اس کے عہد میں نوروز بالکل اسی طرح منایا جاتا تھا، جس طرح کہ اکبر کے زمانہ میں، یعنی جشن کا زمانہ یکم فروردین سے ۱۹ فروردین تک ہوتا تھا۔ پہلے دن بادشاہ زمردیں لباس پہن کر تحویل[1] آفتاب کے وقت دربارِ عام کرتا تھا اور امراء تحفے اور نذرانے پیش کرتے تھے۔ اُنیس دن تک ہر روز امراء میں سے ایک نہ ایک بادشاہ کی دعوت بڑی دھوم دھام سے کرتا تھا۔ ان اشیاء میں عموماً ہاتھی، جواہرات قیمتی کپڑے، خوشبوئیں، چینی کے برتن اور دوسری نادر چیزیں ہوتی تھیں۔ بادشاہ بھی امرا کی ضیافتیں کرتا تھا اور انعام واکرام دیتا تھا۔ منصبوں میں ترقیاں دی جاتی تھیں خطاب ملتے تھے اور اعلیٰ عہدے تقسیم کئے جاتے تھے۔ شاہی محلات اور بازار سجائے جاتے تھے۔ ان سب باتوں کی تفصیل توزوک جہانگیری اور بادشاہ نامہ ملا عبدالحمید لاہوری میں مسطور ہے۔

اکبر کے پیارے مگر پرانے[2] تیوہاروں میں نوروز[3] "خوش روز"[4] کے مبارک نام سے موسوم تھا۔ اُس روز رئیسوں عورتیں، امیروں کی بیگمیں شاہی محل میں دکانیں لگاتی تھیں۔ سجتی سجاتی تھیں (بروئے معاہدۂ خاص، چند اور رعایتوں کے علاوہ، بوندی کا ہاڈا راجا اور اُس کے جاگیرداروں کی رانیاں اور مستورات اس رسم کی پابندی یا مینا بازار کی حاضری سے مستثنیٰ تھیں[5]) بادشاہ خود شمعِ بزمِ عیش یا آپ کی رنگین اصطلاح میں اس پریوں کے اکھاڑے کا راجہ اندر ہوتا تھا بقول منشی مہاراج بہادر برق[6]۔

شاہی محل سنا ہے کہ تھے جلوہ زارِ حُسن — ہر ناز آفریں تھا وہاں تاجدارِ حُسن
حورانِ ہند جو کہ تھیں صدر شکِ آفتاب — سب ہی تو اُنکے سامنے تھیں شرمسارِ حُسن[7]

ہمہ داں وہمہ دانش شیخ ابوالفضل[8] اس تقریب کی تقریب کرتا ہے:

آئینِ خوش روز گیتی خداوند بہ پژدہمش آگہی وشناسا آمدن شگرفکاری روزگار سوئیں روزِ جشن ہرماہ والا انجمنے

---

[1] گھوم جانا، پھر جانا۔ پھرا دینا، گھمانا، لازم اور متعدی دونوں طرح آتا ہے۔ اور سپرد کرنے اور حوالہ کرنے کے معنی استعمال ہوتا ہے۔ یہاں داخل ہونے سے مراد ہے۔ [2] شبنم شاداب وفرہنگ نایاب، ملاظہیر اے قدرشی، مطبوعہ ۱۹۵۶ء صفحہ ۵۱۔ ٹاڈ کا راجستھان انگریزی، مطبوعہ ۱۸۷۳ء مدراس، صفحات ۲، نوٹ ۱۳۵ و ۲۹۰۔ [3] ملاحظہ ہو فرہنگ وحواشی ۱۰۰۔ [4] "خوش روز" ٹاڈ کا راجستھان مطبوعہ ۱۹۲۰ء صفحات ۴۰۰ و ۴۰۱۔ [5] ٹاڈ کا راجستھان ترجمہ صفحات ۱۶-۱۷ و ۶۴۰۔ انگریزی مطبوعہ ۱۸۹۴ء جلد دوم صفحہ ۴۵۲۔ مسٹر بیوریج مآثر الامرا کے انگریزی ترجمہ میں لکھتے ہیں کہ ہاڈا قبیلہ نے مغلوں سے قرابت کرنا گوارا نہیں کیا تھا، صفحہ ۴۰۹۔ ملاحظہ ہو فرہنگ وحواشی نوٹ ۴۰۔ [6] ملاحظہ ہو فرہنگ وحواشی، نوٹ ۳۸۔ [7] مطلع انوار، صفحہ ۱۷۹۔ [8] ملاحظہ ہو فرہنگ وحواشی، مقالہ ۳۹۔

آراید۔ سوداگر زمان برفراز گرم بازاری نشیند وکالائے[1] ہر کشور بدکان پیدائی درآید۔ پرستارانِ مشکوئے[2] اقبال فراہم آیند و پردگیانِ گوناگوں مردم راہ یابند۔ خرید و فروخت راہنگامہ شود۔ گروہا گروہ کامیاب خواہش گردند۔ شہریار دورہین نیز بگزیدانِ کالا دبر نہادنِ نرخِ تازہ بہ نقابے برسازد و بدیں روش شناسائی اندوزد۔ نہفتگی ملک و چگونگی مردم زاد و بد و نیک ہر کارخانہ دریابد۔ و ایں روزہا بدیں نام خواند و نوید خوش دلی بخشید۔ سپس بازارِ مردان انتظام باید بازرگانِ ہر بوم را کام دل برآید۔ خدیوِ عالم داد و ستد را عیار برگیرد و باریافتگانِ عشرت خریداری نمایند۔ و ہر گروہے بے دور باش، چاؤشان[3] دردِ دل برخواند و متاع آرائی را دست مایۂ گزارشِ حال گرداند۔ نیکاں را روزِ مراد پرورد و بداں را باد افراہ[4] سامان باید۔ واز فروغ دیدہ دری بدیں کار گنجورے[5] و مُشرفے[6] جداگانہ باشد۔ ہماں زماں بے رنجِ انتظار زر یابند و فراواں سود بردارند[7]۔

ترکستان کے بازاروں کا دستور یاد کرکے، اسی آئینی ضابطہ کے حوالہ سے مولانا آزاد دہلوی فرماتے ہیں کہ: "ہر مہینے معمولی بازار کے تیسرے دن قلعہ میں زنانہ بازار لگتا تھا۔ غالباً یہ امر آئین میں داخل ہوگا۔ عمل اس پر کبھی کبھی ہوتا ہوگا۔ انھیں ایوانوں میں جو درحقیقت ایجاد اور عقل و شعور کے بازار تھے، زنانہ ہو جاتا۔ وہاں محل کی بیگمات آتی تھیں کہ ذرا اُن کی آنکھیں کھلیں اور سلیقے کی آنکھوں میں سگھڑاپے کا سرمہ لگائیں۔ امراء و شرفا کی بی بیوں کو بھی اجازت تھی کہ جو چاہے آئے اور تماشا دیکھے۔ دُکانوں پر تمام عورتیں بیٹھ جاتی تھیں۔ سوداگری اور سودا زیادہ تر زنانہ رکھا جاتا تھا۔ خواجہ سرا قلماقنیاں، اُردہ بیگنیاں اسلحۂ جنگ سجے، انتظام کے گھوڑے دوڑاتی پھرتی تھیں۔ عورتیں ہی پہروں پر ہوتی تھیں مالیوں کی جگہ مالنیں چمن آرائی کرتی تھیں۔ اسی کا نام خوش روز تھا۔"

"نیک نیت بادشاہ آپ بھی آتا تھا اور اپنی رعیت کی بہو بیٹیوں کو دیکھ کر ایسا خوش ہوتا تھا کہ ماں باپ بھی اتنا ہی خوش ہوتے ہوں گے۔ جہاں مناسب جگہ دیکھتے تھے بیٹھ جاتے تھے۔ بادشاہ بیگم، بہنیں، بیٹیاں پاس بیٹھی تھیں۔ امراء کی بی بیاں سلام کر دیتیں۔ نذریں دیتیں۔ بچوں کو سامنے حاضر کرتیں۔ اُن کی نسبتیں حضور میں قرار پاتی تھیں۔ حقیقت میں یہ بھی آئینِ سلطنت کا ایک جز[8] تھا۔"

اوراقِ تاریخ گواہ ہیں کہ اسی نوروز کے موقع پر جہانگیر کی آنکھ مہرالنسا (نورجہاں) سے لگی تھی۔ اور ناز و نیاز کے مرحلے طے ہوئے تھے۔

---

[1] اسباب، رخت، متاع غیر حیوان۔ [2] بت خانہ۔ مجازاً امراء اور بادشاہوں کی حرم سرا۔ [3] ترکی بروزن طاؤس۔ لشکر و قافلہ کا نقیب ——
[4] گناہ کی جزا۔ برائی کی مکافات۔ [5] گنج در خزانہ دار۔ [6] لکھنے والا جو اور لکھنے والوں کے اوپر ہو۔ جو ان لوگوں کی خیانت سے خبردار رہے۔
[7] آئین اکبری، جلد اول صفحہ ۴۲، مطبوعہ نولکشور ۱۸۹۳ء۔ نیز ملاحظہ ہو اکبرنامہ، جلد سوم، صفحات ۲۳، ۲۰۰، ۲۳۶ وغیرہ۔ [8] دربار اکبری، صفحات ۱۵۴ و ۱۵۵ "مینا بازار۔ زنانہ بازار"

یہ کہہ گئیں چھٹنے کی نہیں رسم محبت سمجھے نہیں تم خود بھی جو خر ما گئیں آنکھیں

عشق و محبت کا روگ تو اسی دوشیزگی میں اپنے سر لے لیا تھا، مگر اکبر کی قہرمانی سے کچھ چلی نہیں۔ جب وقت آیا تو دونوں خوب کھل کھیلے۔[1]

اکبر کے بعد جہانگیر نے وہی احتشام اور طمطراق قایم رکھا جس کی بنیاد باپ نے ڈالی تھی۔ اس کی صراحت و تفصیل بقدر ضرورت اوپر ہو چکی۔ شاہجہاں نے اس رسم کو بالکل اُٹھا دینا چاہا۔ یہ تو نہ کر سکا۔ تاہم نوروز کے جشن میں بہت سی اصلاح اور ہر نوع سے کمی ہو گئی۔ پہلا سا تجمل اور کرّ و فر باقی نہ رہا۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ بلکہ بہت کچھ ہوتا رہا۔ اورنگ زیب عالمگیر نے جشنِ نوروز کی تقریب کو قطعاً ممنوع قرار دیا۔ اس کے بڑے بیٹے محمد معظم نے شاہزادگی کے زمانہ میں ایک سال اس کو منانا شروع کیا تھا بیدار دل ہمہ آگاہ بادشاہ کو خبر پہونچی۔ فرزند سعادت توام کو بزرگانہ ملامت و سرزنش فرمائی۔ رقعاتِ عالمگیری (رقعہ ۲) میں[2] مرقوم ہے۔ "امسال نوروزے بطور اہل ایران بہ تکلف کردہ اند، چوں ایں روز از اعیادِ مجوس ست و بہ اعتقادِ ہنود روزِ جلوس بکرماجیت و مبدا تاریخ من بعد بہ عمل نیاید و چنیں جہالت بہ فعل نگراید۔" اس کے عہد سے یہ جشن قطعاً غیر مشروع و منسوخ قرار پا گیا عالمگیر نامہ میں منشی محمد کاظم نے اس کے متعلق شاہی احکام و ہدایات کو نقل کیا ہے[3]۔ تاہم عوام و خواص کم و بیش مناتے ہی رہے شعرا بھی دل کے ولولے نکال لیتے تھے۔ (مغل اور راجپوت زن و شو کی معاشرت) **مقبول احمد صمدانی**

---

[1] ڈی لیٹ کی تاریخ مغول، صفحہ ۱۸۱، دفعہ ۲۶۔ تاریخ راجستھان از پرانند صفحات ۳۷۶ و ۳۷۷۔ [2] ٹاڈ کا راجستھان، انگریزی مطبوعہ ۱۹۲۰ء صفحات ۴۰۰ و ۴۰۱۔ [3] مطبوعہ کلکتہ کالج پریس، ۱۸۷۴ء۔ صفحہ ۳۸۹۔

دی مغل لائن لمیٹڈ

(سب سے پرانی ہندوستانی جہازراں کمپنی)

بحر احمر اور ماریشس

کی بندرگاہوں کو مسافر اور مال لے جانے والے جہازوں کا پیڑہ بمبئی سے :-

عدن، پورٹ سوڈان، جدہ اور مصر

کی بندرگاہوں کے درمیان ہمارے جہازوں کی آمد و رفت باقاعدگی اور خوش اسلوبی سے ہوتی ہے اور امید ہے کہ ہم حسب ضرورت دوسری بندرگاہوں کو بھی اپنے جہاز بھیج سکیں گے

خاص حج سروس

جو حضرات حج کی سعادت حاصل کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں وہ مندرجۂ ذیل پتہ پر اپنی درخواستیں جلد بھیجدیں۔ لیکن یہ امر ملحوظ رہے کہ جہاز میں جگہ ملنے کی گارنٹی نہیں دی جا سکتی

ٹرنر مارین اینڈ کمپنی لمیٹڈ

۱۶۔ بنک اسٹریٹ۔ بمبئی

سنجر کاشانی

سنجر (متوفی ۱۰۲۱ھ) اکبری دور کا ایک ممتاز شاعر گزرا ہے۔ اس کی شاعری کی شہرت خود اس کے زمانہ میں دکن، شمالی ہند اور ایران ہر جگہ پہونچ چکی تھی۔ چار معاصر تذکروں میں اس کے حالات وغیرہ خصوصیت کے ساتھ مندرج ہیں۔ یعنی عرفات العاشقین، ماثر رحیمی، خلاصۃ الاشعار اور میخانہ میں سنجر کے مستند حالات پائے جاتے ہیں۔ عرفات کا مولف تقی اوحدی اس سے کئی بار اصفہان میں مل چکا ہے۔ صاحب ماثر اس کا ہم وطن تھا اور اس کا باپ میر حیدر خود مولف کا دوست اور اس کے بھائی آقا خضرائے نہاوندی وزیر کاشان سے متعلق تھا، اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ سنجر بھی مولف کا دوست اور شناسا رہا ہوگا۔ خلاصۃ الاشعار کا مولف تقی الدین کاشی بھی سنجر کا ہم وطن تھا، اس سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ اس سے بھی ملاقات ہوئی ہوگی۔ خلاصۃ الاشعار کا کوئی مکمل نسخہ ہندوستان کے کسی کتاب خانہ میں موجود نہیں۔ رام پور کے سرکاری کتاب خانہ کا نسخہ اول اور آخر سے ناقص ہے اور شعرائے کاشان میں چند شعرا بشمول سنجر اور حیدر اس میں مذکور نہیں ہیں البتہ اسپرنگر کی فہرست میں ان کا ذکر موجود ہے، میخانہ کا بھی سنجر کا معاصر تھا، اس نے اس کے متعلق تفصیلی حالات لکھے ہیں، بعض باتیں اس تذکرہ میں بہت کام کی ہیں جن سے بہت مفید نتیجے نکلتے ہیں۔ ان کے علاوہ چند دوسرے تذکروں سے سنجر کی حیات مرتب کرنے میں مدد لی گئی ہے۔

نام و خاندان

سنجر کا نام میر محمد ہاشم ہے۔ اس کا باپ میر رفیع الدین حیدر معمائی رفیعی تھا جو طباطبائی سادات کے ایک معزز و محترم گھرانے کا رکن تھا، ماثر میں ہے[1]۔

"حیدر از سادات عالی نشان رفیع مکان طباطبائی کاشان است"

باقر کاشی کے ایک تاریخی قطعہ سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ طباطبائی سید تھا۔ عرفات العاشقین میں بھی سنجر کی نجابت و شرافت کا ذکر موجود ہے، شرافت حسبی و نسبی کے ساتھ اس کے آبا و اجداد کا شمار ایران کے ممتاز لوگوں میں ہوتا تھا خود اس کا باپ شاہی دربار میں بڑا معزز تھا، اہل کاشان کا مذہبی پیشوا تھا اور یہ پیشوائی اس کے خاندان میں وراثتاً چلی آتی تھی۔ ماثر میں بذیل میر حیدر لکھا ہے۔

"در تربیت بادشاہ ذی شان صفویہ نشو و نما یافتہ و ہموارہ بہ مزید تقرب آں گرامی طبقہ از ہم گناں ممتاز بود و تقدم و پیشوائی کاشان ارثاً و استحقاقاً بہ موی الیہ متعلق بود"

---

[1] ورق ۱۲۷ ب سطر ۱۳

میر مذکور کا شاعری میں جو درجہ ہے اس سے قطع نظر وہ اچھا خاصہ با اثر اور ممتاز مورخ بھی تھا۔ چنانچہ محتشم، وحشی، غیرتی، فہمی، حاتم، اور کاشان کے دوسرے ممتاز شعرا اس سے متعلق تھے۔

میر حیدر کی چار اولادیں تھیں چنانچہ سنجر ایک قصیدے میں اپنی ماں ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

ماچار دُر ازاں صدفیم

میر معصوم، سنجر کا بھائی تھا جو شاہجہانی دور کا ایک ممتاز شاعر گزرا ہے۔ صائب اور کلیم سے اس کی بڑی دوستی تھی۔ چنانچہ صائب کہتا ہے:

بغیر صائب و معصوم نکتہ سنج و کلیم — دگر کہ از اہل سخن دوستان یکدگر اند

عرفات میں اس کے متعلق صرف اس قدر لکھا ہے کہ سنجر کا بھائی نہایت خوش فہم اور عالی ہمت تھا، اسکا پھوپھی زاد بھائی میر حسینی بھی ایک مشہور شاعر گزرا ہے یدبیضا میں اس کا مختصر تذکرہ موجود ہے۔

تخلص تخلص سنجر تھا اور دیوان میں عام طور سے یہی استعمال ہوا ہے مگر دو قصیدوں میں جو اکبر کی تعریف میں ہیں اور ایک قطعہ اور ایک غزل میں اس نے فراغی بھی تخلص کیا ہے، اس قطعہ میں وہ کہتا ہے کہ یہ تخلص بادشاہ نے اس کو دیا تھا، چنانچہ اکبر کو مخاطب کر کے لکھتا ہے:

خسروا در دیار ہمت تو — شخص امید تو اں باشد
صلہ دادی تخلصم دادی — ہیچ اکنوں مرا نہ می باید
ہاں فراغی خمش خمش کاینجا — نطق سحباں بہ صرفہ بگشاید

مآثر رحیمی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کو فراغی تخلص عطا ہوا تھا۔

"خلیفۂ الٰہی تخلص فراغی بہ آں دانشور عنایت نمودند، و غزلے چند بہ تخلص فراغی و سنجر بہ نظم آوردہ بہ بادشاہ خواند، جہاں ہاں جہاں دار را۔ ظاہر شد کہ تخلص سنجر را بہتر از فراغی می داند از ہمیں حکم فراغی تخلص او را برطرف ساختہ سنجر را تخلص ساختہ مختار ساختند۔ بہ مقتضائے طبیعت خود سنجر را اختیار نمود"

پیدائش سنجر کی پیدائش کاشان میں ہوئی تھی۔ لیکن کسی تذکرہ میں اس کا سنہ پیدائش نہیں ملتا۔ اس لئے اسکی وفات اور عمر سے اس کا سال پیدائش معین کرنا ہے۔ بقول میخانہ ۴۸ سال کی عمر میں سنجر کا انتقال ہوا اور چونکہ اس کی صحیح تاریخ وفات ۱۰۲۱ھ ہے اس لئے اس کی پیدائش کا سال ۹۷۳ھ ہوا۔

قیام کاشان اور ابتدائی حالات اس کی پیدائش ایران کے مردم خیز شہر کاشان میں ہوئی جب اس نے آنکھ کھولی تو اپنے گرد نہایت عمدہ علمی ماحول پایا، اس کا گھر شعرا کی بزم گاہ تھا

---

۱ ورق ۲۱۰ ب — ۲ صفحہ ۲۰۲ — ۳ ورق ۱۲۲ — ۴ تتمۂ حواشی میخانہ صفحہ ۱۰۷ — ۵ صفحہ ۲۵۲

اس نے خود اپنے باپ کے سایۂ عاطفت میں کسب علوم کیے، ماثر[1] میں ہے:

"در کاشان در صحبت فیض بخش پدر بزرگوار کسب جمعیات و استعداد نمودہ شہرۂ عصر و معروف دہر گردید"

لیکن ہاشم کو علمی ماحول کی بہ نسبت لہو و لعب سے زیادہ شوق و رغبت تھی اسی وجہ سے قیام کاشان کے دوران میں میں شعر و شاعری سے زیادہ دلچسپی نہیں رکھتا تھا، البتہ محض تفنن طبع کے جب کبھی کچھ کہتا تو بے حد کامیاب اشعار لکھتا ماثر[2] میں مذکور ہے:

"چوں عنفوانِ جوانی در میان بہارستان و کامرانی ایشان بود و بہ لہو و لعب گرفتار بود بر تو التفات بر نظم ابکار افکار کمتری انداخت و گاہے کہ متوجہ می شد بغایت نیکوی فرمود"

عرفات[3] میں بھی لکھا ہے کہ "در ایران بر سبیل ندرت گاہے مرتکب سخن می شد"

غرض اس طرح بے قیدی و آزادی میں اس نے اپنی زندگی کی چند منزلیں طے کیں۔

قیام اصفہان

اول جوانی میں سنجر نے اپنے وطن کاشان کو خیرباد کہہ دیا اور وہاں سے اصفہان کی طرف رخ کیا اور کچھ دنوں یہاں آکر قیام کیا۔ مگر تذکروں میں اس کے قیام اصفہان کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا، لیکن تقی اصفہانی نے ایک جگہ لکھا ہے[4] کہ "در صفاہان مکرر او را دریافتہ بہ صحبت وے رسیدہ ام" دوسری جگہ یہ جملہ[5] اس کے تذکرہ میں پایا جاتا ہے۔ "وقتے کہ وے در صفاہان بود"۔ ماثر[6] میں بھی اس کے اصفہان آنے اور آقا تقی معرف اصفہانی سے تعلق و ربط و اختلاط پیدا کرنے کا ذکر ہے، لیکن وہ اصفہان کب اور کیوں آیا؟ اس کا جواب ذرا مشکل ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ عباس سے اس کے باپ میر حیدر کو کوئی آزار پہونچا، چنانچہ وہ ۹۹۹ھ میں وہاں سے نکل کر ہندوستان چلا آیا۔ ماثر رحیمی[7] میں صرف حیدر کے معرضِ عتاب میں آنے کا تذکرہ ہے لیکن صحف ابراہیم بیان[8] سے صاف پتہ چلتا ہے کہ "باپ اور بیٹے دونوں ماخوذ ہو کر جلاوطن ہوئے"، چنانچہ دونوں نے ساتھ ساتھ کاشان چھوڑا"، معلوم ہوتا ہے کہ اس کا باپ وہاں سے ہندوستان چلا آیا اور میر سنجر بجائے ہندوستان کے اصفہان چلا گیا۔ اس طرح ان دونوں کے وطن سے نکلنے کی تاریخ ۹۹۸ھ کے قریب ہوگی، تقی اوحدی کے بیان سے کچھ اس تاریخ کی تائید ہوتی نظر آتی ہے۔

تقی اوحدی اگرچہ اصفہانی المولد ہے لیکن اس کی زندگی کا بیشتر حصہ سیر و سیاحت میں گزرا، صرف ذیل کے سنین[9] کے مابین وہ اپنے وطن اصفہان میں موجود تھا۔

(۱) پیدائش سے ۹۸۹ھ تک (۱۶ سال کی عمر تک) ——— (۲) ۹۹۳ھ سے ۹۹۶ھ تک

(۳) ۱۰۰۰ھ سے ۱۰۰۳ھ تک ——— (۴) ۱۰۰۹ھ سے ۱۰۱۳ھ تک

---

[1] ، [2] ورق ۱۲۱ ب۔ [3] ، [4] ، [5] ورق ۳۲۵ ب۔ [6] ورق ۱۲۱ ب۔ [7] ورق ۱۲۰ ب۔ [8] ورق ۴۳۰ ر۔ [9] مقدمۂ عرفات

اول الذکر تاریخوں میں سنجر کی عمر ۹ سال سے کم تھی، ثانی الذکر میں اس کی عمر ۱۳ اور ۱۶ سال کے درمیان تھی ان تاریخوں میں اس کا باپ میر حیدر کاشان میں موجود تھا۔ اس کی موجودگی سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ اس نے ۱۳ سال کے نوعمر لڑکے کو کاشان سے باہر نہ جانے دیا ہوگا۔ مزید براں ۱۳ سال کے لڑکے کی خدمت میں تقی اصفہانی کا جانا قرین قیاس نہیں۔ پس ان تاریخوں میں سنجر کا وطن سے نکلنا ممکن ہے، البتہ ۹۹۹ ہجری کے قریب جب اس نے اپنی زندگی کی ۱۹ منزلیں پوری کرلی تھیں، اصفہان پہونچنا صحیح معلوم ہوتا ہے۔ ۱۰۰۰ھ میں جب تقی اصفہانی[1] شیراز سے اصفہان آیا ہوگا تو اس کی خدمت میں پہونچا ہوگا۔

بہرحال یہ چیز تقریباً مسلم ہے کہ سنجر اصفہان میں زیادہ دنوں تک قیام نہ کرسکا۔ مآثر کی روایت[2] کی بنا پر ۱۰۰۰ھ میں وہ ہندوستان چلا آیا۔ لیکن میخانہ کے بیان[3] کے مطابق وہ ۲۳ سال کی عمر میں ہندوستان میں وارد ہوا تھا۔ اگر یہ روایت صحیح مان لی جائے تو اس کے ورود ہند کا سال ۱۰۰۳ھ اور اس کے کل قیام کا زمانہ ۱۸ سال ہوگا۔ لیکن سنجر نے ایک قصیدہ میں لکھا ہے کہ وہ ہندوستان میں نصف قرن یعنی ۲۰ سال مقیم رہا ہے، اس سے مآثر کی روایت کہ وہ ۱۰۰۰ھ میں ہندوستان آیا زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے، پس اس کے قیام اصفہان کا زمانہ ایک سال سے قدرے زاید سمجھنا چاہئے۔

اس کے قیام اصفہان کا ایک اہم واقعہ مآثر اور عرفات دونوں میں موجود ہے۔ اول الذکر میں[4] ہے:

"در ایام آقا تقی معرف اصفہانی کہ از مشاہیر مقبولان و معشوقان اصفہانی بود و با وجود حسن جمال بہ حیثیت و کمال نیز آراستہ بود و اکثرے از مستعدان اصفہان مثل حکیم شفائی و دیگر شیفتۂ وے شدہ بودند، میر سنجر را میل و توجہے بہ ایں نادر زمان خود بہم رسیدہ بود..... و مدے مدید بہ ایں بلیہ گرفتار بود، ایں بیت دراں باب از ایشان در اصفہان سرزد

بہ قتلم نمی برد نرمانِ تو زچشم تو افتاد مژگان تو

والحق ایں بیت در سراسر ایران دوید و باعث اشتہار آقا تقی و عشق میر سنجر شد"

عرفات[5] کا بیان بھی بہت اہم ہے:

"وقتے کہ وے در صفاہان بود و ازاں جا متوجہ ہند می شد ہر کس بہ جہت ذالثعلب آقا تقی بن ملک معرف، اشعاری گفت و نیز ایں بیت گفت و الحق خوب گفت

آقا تقی بن ملک معرف[6] اصفہانی جس سے میر سنجر وابستہ تھا مولف عرفات کا پڑسی تھا، اس کے حسن وغیرہ کا بیان

---

[1] مقدمۂ عرفات و ورق ۵۰۲ ب — [2] ورق ۱۲۱ ب — [3] صفحہ ۲۴۹ — [4] ورق ۱۲۱ ر — [5] ورق ۲۲۵ ب

[6] "آں کس باشد کہ در مجلس سلاطین مردماں را بجائے لائق ہر کدام نشاند" غیاث صفحہ ۴۸۶

عرفات[1] میں اس طرح پایا جاتا ہے:

"ہوائے گلشن عذارش در غایت نزاہت، رقماش کارگاہ خاطرش در نہایت لطافت دران حسن قضا راذار الشعلبی بہم رسانید، شعرائے صفاہان در فروریختن سبزۂ باغ جمالش اکثر ابیات مناسب و معانی تازہ گفتہ اند، منزل وے در صفاہان باکلبۂ احزان قابل یک سمت و یک محلہ واقع ست و مابین پیشینیگان مخلص و آبائے ایشاں خصوصیت تام بودہ ..... و با تقی در سفر ہند ہمراہ و رفیق بودم ... و اکثر اوقات در صحبت قابل و حکیم شفائی کہ از احبائے وے بود دیداران داعزہ دیگر صفاہان بسر می کرد لیکن قاضی بدیع الزماں میلے صادق و مجتمعے وافر داشتند"

تقی کے آباؤ اجداد کو ایران کے شاہی دربار سے وابستگی تھی۔ لیکن نہ معلوم کن وجوہ سے تقی معرف اور اس کا بھائی معزائے[2] معرف دونوں اپنے وطن سے نکل کر ہندوستان چلے آئے اور دربار مغلیہ سے منسلک ہو گئے۔

مآثر[3] میں تقی کا مفصل حال لکھا ہے لیکن اس کے حسن و جمال کا ذکر حالات کے سلسلہ میں نہیں پایا جاتا۔

ورود ہند میخانہ کی روایت کے بموجب سنجر ۲۳ سال کی عمر میں ہندوستان آیا۔ مآثر نے اس کے ورود کا سنہ ۱۰۰۰ھ تجویز کیا ہے، لیکن چونکہ اس کی پیدائش کا سنہ ۹۸۰ھ قرار دیا گیا ہے اس لئے یا تو مآثر کی تاریخ غلط ہوگی یا میخانہ کی مقرر کی ہوئی عمر، سنجر کے ذیل کے شعر سے ثابت ہوتا ہے کہ اس نے نصف قرن سے زیادہ ہندوستان میں قیام کیا ہے:-

ہمی گوید دانی کز بعد نیم قرن خطاست — ز ہندوستان بہ ایراں شدن ندیدہ دکن

قرن ۱۰۰ سال کی مدت کو کہتے ہیں۔ اس لئے اس کے ہند کے قیام کی مدت کم از کم ۲۱ سال ہوتی ہے۔ چونکہ اسکی وفات ۱۰۲۱ھ میں ہوئی اس سے مآثر کی بیان کی ہوئی تاریخ زیادہ قرین قیاس ہے، بس جسوقت سنجر ہندوستان میں داخل ہوا اس کی عمر ۲۰ سال سے متجاوز ہو چکی تھی، صحف ابراہیم[5] میں لکھا ہے کہ سن صبا میں ہندوستان آیا، ۲۰ سالہ نوجوان کی عمر کا شمار سن صبا میں ہو سکتا ہے۔

سنجر ہندوستان میں کہاں سے آیا؟ اپنے وطن کاشان سے یا اصفہان سے۔ مآثر[6] کی روایت سے بظاہر ایسا پتہ چلتا ہے کہ جب ۹۹۹ھ میں اس کے والد ہندوستان چلے آئے تو وہ کاشان ہی میں رہ گیا۔

"میر حیدر بہ دیار ہندوستان شتافت و میر سنجر در کاشان ماند و نیز بتاریخ سنہ ہزار ہجری بجانب ہندوستان آمد"

میخانہ[7] میں بھی اسی طرح کا بیان ہے:

"بعد از چند گاہے کہ پدرش میر حیدر معمائی بہ ہند آمد او نیز در سن بیست و سہ سالگی بعد از پدر وطن خروج نمودہ ... بہ ہندوستان آمد"

لیکن عرفات العاشقین میں صراحتاً مذکور ہے کہ ہندوستان میں داخل ہونے کے قبل سنجر ۱۲ صفہان میں مقیم تھا اور آقا تقی معرف

---

[1] ورق ۱۲۶ وفات رمضان ۱۰۲۱ھ۔ [2] ورق ۲۱، ۱۰۱۷ھ میں ہندوستان آیا اور نورالدین قلی کوتوال آگرہ سے متعلق ہوا۔ وفات محرم ۱۰۲۲ھ ج ۳ صفحہ ۱۴۸۴۔ [4] لسان العرب ج ۱، ص ۲۱۱، ۲۱۳ — [5] ورق ۴۳۰ ر — [6] ورق ۱۱۱ ر — [7] ص ۲۵۰۔

اصفہانی سے جو تعلقات بیان کئے جاتے ہیں وہ اسی درمیان میں رونما ہوئے مشہور شعر جو مآثر اور عرفات دونوں میں (تقی معرف کی تعریف میں) درج ہے وہ بقول تقی اوحدی ہندوستان میں داخل ہونے کے ذرا قبل اصفہان میں کہا گیا تھا لیکن صاحب مآثر کا بیان اُلجھا ہوا ہے وہ لکھتا[1] ہے کہ بقول تقی اوحدی اس شعر کی تحریر کے وقت وہ اصفہان میں تھا، اور آقا تقی کے ساتھ تعلقات اصفہان ہی میں قایم ہوئے تھے لیکن ہندوستان میں داخل ہونے کے قبل وہ کاشان اپنے وطن میں تھا، لیکن چونکہ اسی درمیان تقی اوحدی سنجر سے اصفہان ہی میں مل چکا ہے لہذا اس کا بیان مستند ہے، اس تفصیل کی اجمال یہ ہے کہ ۱۰۰۰ھ میں وہ اصفہان ہی تھا اور وہیں سے وہ ہندوستان آیا ہے۔

مذکورۂ بالا تشریح سے یہ امر آئینہ ہو جاتا ہے کہ سنجر اکبر بادشاہ کے عہد میں داخل ہند ہوا لیکن تمام راویوں کے برخلاف مخزن الغرائب[2] میں لکھا ہے کہ سنجر کئی بار شاہ جہاں کے عہد میں ہندوستان آیا، مگر یہ بیان مستند نہیں قرار پا سکتا کیونکہ شاہجہاں کا سال جلوس ۱۰۳۷ھ ہے اور اس کے ۱۶ سال قبل ہی سنجر سفر آخرت اختیار کر چکا ہے اور چونکہ ہندوستان میں آکر وہ ایران واپس نہیں ہوا ہے، اس لئے اس کے کئی بار ہندوستان آنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

صاحب مخزن نے یہ بھی لکھا[3] ہے کہ سنجر کا باپ حیدر دو بار شاہجہاں کے عہد میں ہندوستان آیا، اس کا دوبارہ ہندوستان آنا اس طرح ثابت ہے کہ ایک دفعہ حج کی نیت سے روانہ ہوا، دو لاکھ روپیہ کی اجناس نفیس اس کے ساتھ تھیں۔ دریائے عمان[4] میں اس کی کشتی ڈوب گئی اور سب مال قزاقان ساحل کے ہاتھ آیا۔ اور میر حیدر خود نیم جاں ہو کر ہندوستان پہونچا۔ کچھ دنوں یہاں قیام کیا اور پھر ۱۰۰۹ھ کے قریب دوبارہ حج کو گیا۔ مگر شاہجہاں کے عہد سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا، اسکے تخت نشین ہونے کے ۳۸ سال قبل وہ ہندوستان آیا تھا، ۲۸ سال قبل یہاں سے واپس ایران ہوا اور وہیں ۵ سال قبل پیوند خاک ہو گیا۔

مخزن ہی میں حیدر کا یہ واقعہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ شاہ جہاں نے میر کے سامنے ایک انگشتری نکالی اور اس سے تاریخ کہنے کی فرمایش کی۔ اس نے "انگشتری" اسکی تاریخ کہی، پھر بادشاہ نے دوسری انگوٹھی نکالی اور دونوں کی تاریخ لکھنے کا حکم دیا۔ میر حیدر نے فی البدیہہ عرض کیا "دو انگشتر"۔ اس میں مزید یہ بھی مرقوم ہے کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ واقعہ شاہ عباس والی ایران کے ساتھ پیش آیا۔ مگر مولف کے دونوں قیاسات غلط ہیں۔ "انگشتری" اور "دو انگشتر" کے اعداد ۹۸۱ ہوتے ہیں، اس لئے اس واقعہ کا تعلق نہ شاہ جہاں والی ہند اور نہ شاہ ایران عباس کبیر (۹۹۶ - ۱۰۳۸) سے ہے، البتہ اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو شاہ طہماسپ (۹۳۰ - ۹۸۴) کے عہد کا ہوگا۔ اس کے دربار سے حیدر کا تعلق ظاہر ہوتا ہے۔ بقول مولف مذکور حیدر نے شاہ عباس کی تخت نشینی (۹۹۶ھ) اور شاہ اسماعیل کی وفات (۹۸۵ھ) کی تاریخیں لکھی ہیں۔ یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ ان تاریخوں میں وہ ایران میں موجود تھا۔

(باقی)

پروفیسر نذیر احمد ام-اے

---

[1] ورق ۱۲۱ ر - [2] صفحہ ۳۵۵ - [3] صفحہ ۲۷۵ - [4] خوش نے گجرات و مکران کے درمیان لکھا ہے۔

بابُ الانتقاد

جناب سیماب کی سدرۃ المنتہیٰ پر ایک سرسری نظر

انوارِ حقیقت کی کرنیں جو رُوکے رُوکے رہتی ہیں — وہ اونچی اونچی باطل کی دیواریں ڈھانے آیا ہوں

شاعر کا مطلب یہ ہے کہ میں باطل کی وہ اونچی اونچی دیواریں ڈھانے آیا ہوں جو انوارِ حقیقت کی کرنیں روکے روکے رہتی ہیں ——— لیکن روکے رہتی ہیں کی جگہ روکے روکے رہتی ہیں کہا گیا ہے جو بالکل خلاف محاورہ ہے

دیکھوں اس دورِ رنگیں میں کس طرح خزاں کے پاؤں جمیں — باغ اپنے دامن پھیلا لے میں رنگ جمانے آیا ہوں

دامن پھیلانا اُس موقع پر بولتے ہیں جہاں کچھ لینا مقصود ہوتا ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آیا کہ باغ اپنا دامن کیوں پھیلا لے۔ آپ باغ کو کچھ دینے تو آ نہیں رہے ہیں آپ تو رنگ جمانے آ رہے ہیں اور رنگ جمانے کو لینے یا دینے سے کوئی واسطہ نہیں، لہذا یہاں باغ کا دامن پھیلانا بالکل بے محل ہے جس کے کوئی معنی نہیں۔ دوسرے "باغ اپنے دامن پھیلا لے" بھی خلافِ محاورہ اور خلافِ واقعہ ہے۔ ایک وقت میں ایک ہی دامن پھیلایا جا سکتا ہے اگرچہ دامن پھیلانے والے کے پاس ایک سے زیادہ ہی دامن کیوں نہ ہوں اس لئے اپنے کی جگہ اپنا ہونا چاہئے۔ علاوہ اس کے پہلے مصرعہ میں جمتے ہیں کی جگہ جمیں استعمال کیا گیا ہے۔

زہے مرگِ محبت زندگی انجام ہے جس کا — حیاتِ جاوداں برحق مگر پھر جاوداں کب تک

شاعر حیاتِ جاوداں کو برحق تسلیم کرنے کے بعد کہتا ہے "مگر پھر جاوداں کب تک" یعنی حیاتِ جاوداں کو برحق بھی مانتا ہے اور اُس کے جاوداں ہونے پر شک بھی کرتا ہے۔

بگڑنا آدمی کا اور بننا پھر بگڑ جانا — یہ کس کے ہاتھ میں نبضِ مزاجِ آدمیت ہے

پہلے مصرعہ میں بننا کی جگہ بن کر ہونا چاہئے۔ دوسرے مصرعہ میں محاورہ کی غلطی ہے۔ اصل محاورہ رگ ہاتھ میں ہونا ہے نہ کہ نبض۔

شگفتِ دل کی مہلت عمر بھر مجھ کو نہ دی دل نے — کلی کو رات بھر میں پھول بن جانے کی فرصت ہے

"شگفت" کا استعمال "شگفتگی" کے معنی میں غلط ہے۔

ناروا سیماب ہے فکرِ کشودِ ہست بود — راز یہ سمجھا گیا ہے اور نہ سمجھا جائے گا

"کشودِ ہست و بود" کی ترکیب صحیح نہیں، "کشودِ رازِ ہست و بود" ہونا چاہئے تھا۔ فارسی میں کشودنِ راز۔ کشودنِ معما۔ کشودنِ کار۔ کشودنِ گرہ وغیرہ مستعمل ہیں اور اسی لحاظ سے یہاں "کشودنِ رازِ ہست و بود" کہنا چاہئے تھا مثلاً :-

بسیار ہمچو غنچہ بخونِ جگر نشست — در باغِ دہر ہر کہ چو گل رازِ خود کشود (نامعلوم)

ساقی قدحے در دہ از خود بستاں مارا — مستانہ بگو رمزے بکشائے معما را (حزیں)

حالیا خواہد کشود از دولتم کارے کہ دوش — من ہمی کردم دعاؤ صبحِ صادق میدمید (حافظ)

درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں — جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا (غالب)

سنگِ در سر پہ ہے در پر نہیں اب سر میرا — اہلِ کعبہ مرے سجدوں کا سلیقہ دیکھیں

آستاں بر سر ہوں میں دنیا ہے سر بر آستاں — اب یہ پوچھو آستاں سے کون سرافراز ہے

شاعر نے اس دعویٰ کی کہ "سنگِ در سر پہ ہے" یا "آستاں بر سر ہوں میں" کوئی دلیل پیش نہیں کی ہے۔ اگر سنگِ در یا آستاں سر پر اُٹھائے جانے کی کوئی چیز ہوتی تو دلیل کی ضرورت نہ تھی۔ اگر مقصود یہ کہنا ہے کہ میں تو وفورِ شوق یا فرطِ جنوں سے سنگِ در یا آستاں کو اپنے سر پر لئے پھرتا ہوں تو البتہ درست ہو سکتا ہے لیکن اس مفہوم کی رکاکت ظاہر ہے۔

دیوانے کو تحقیر سے کیوں دیکھ رہا ہے — دیوانہ محبت کی خدائی کا خدا ہے

بظاہر اس شعر میں کوئی عیب نہیں معلوم ہوتا مگر غور کیجئے تو آپ محسوس کریں گے کہ دوسرے مصرع میں بہت بڑا عیب موجود ہے۔ شاعر نے "محبت کی خدائی" لکھا ہے یعنی جہاں محبت بحیثیت خدا کے ہو۔ اب دوسرے مصرع کا مطلب یہ ہوا کہ "جہاں محبت کی خدائی ہے وہاں دیوانہ خدا ہے" یہ دو خداؤں کا اجتماع ناقابلِ فہم ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خدائی دنیا جہان کے معنے میں بھی آتا ہے، لیکن اس وقت جب تنہا لفظ خدائی استعمال کیا جائے یا خدا کی خدائی کہا جائے۔ محبت کی خدائی کہکر محبت کی دنیا مراد نہیں ہو سکتی

انگڑائیاں لینے ہی کو ہیں قافلے والے — آواز دئے جائے حدی خواں کوئی دن اور

ردیف اور قافیے کی مجبوریاں بھی شاعر سے عجیب عجیب قسم کی غلطیاں کراتی ہیں۔ یہاں بھی ردیف کی مجبوری نے شعر میں ایک بہت بڑا عیب پیدا کر دیا ہے۔ شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ رات گزر چکی، صبح ہو رہی ہے اور حدی خواں نے اپنا نغمہ شروع کر دیا ہے مگر قافلے والے ابھی اُٹھے نہیں ہیں، چنانچہ شاعر کہتا ہے کہ قافلے والے انگڑائیاں لینے ہی کو ہیں حدی خواں کوئی دن اور آواز دے جائے۔ اگر دوسرے مصرع میں "کوئی دن اور" کی جگہ "کچھ دیر اور" یا "کوئی دم اور" ہوتا تو درست تھا۔ علاوہ اس کے دئے جائے کی جگہ دئے جا ہونا چاہئے۔

ہوں محوِ رنگ و بو میں ابھی صبحِ باغ میں یہ کون کھینچتا ہے طنابیں بہار کی

سیماب صاحب نے بہار کی طناب کھینچنا بہار کے زوال کے معنی میں استعمال کیا ہے جو صحیح نہیں ہے "طناب کشیدن" صحت و کمال کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ مثلاً:

سائبانِ صحبتش چو زنند ،، دل زر گہائے جاں طناب کشد (ظہوری)

اُلٹ دے دل کو بھی جب دل کے سب پردے الٹ جائیں اُسے بھی کر نمایاں جو نمایاں ہو نہیں سکتا

دل کا اُلٹ دینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ظاہر ہے کہ یہاں دل کو اُلٹ دینا لفظی معنوں کے اعتبار سے استعمال نہیں کیا گیا اور محاورے کے اعتبار سے دل کو اُلٹ دینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ غالباً سیماب صاحب نے دل کو اُلٹ دینے سے یہ مطلب لیا ہے کہ جو کچھ دل کے اندر ہے اس کو بھی ظاہر کر دے۔ اگر مقصود یہی ہے تو اس کے ظاہر کرنے کیلئے جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں وہ بالکل غلط ہیں — اُلٹ دینا اُن ہی چیزوں کے لئے بول سکتے ہیں جن کو واقعی اُلٹ دینے سے اُن کے اندر کی چیزیں باہر نکل آئیں اور ظاہر ہے کہ اس معنی میں دل اُلٹنے کی چیز نہیں۔ محاورے میں دل اُلٹ دینا، پریشان کرنے کے معنی میں آتا ہے، سودا کہتا ہے "تیر نگہ نے تیرے دلوں کو اُلٹ دیا" اور یہاں پریشان کرنے کے مفہوم میں اس کا استعمال نہیں ہوا۔ دل اُلٹنا البتہ دیوانہ ہونے کے معنی رکھتا ہے اور سیماب صاحب نے غالباً اسی مفہوم میں الٹ دینا استعمال کیا ہے جو صحیح نہیں۔

میرے مآلِ دید کی بیچارگی نہ پوچھ ، سو بجلیوں نے گھیر لیا اک نگاہ کو

اس شعر میں مآل اور بیچارگی میں سے ایک لفظ بیکار ہے۔ اگر مآل دید کہیں تو پھر بیچارگی بیکار ہے اور اگر بیچارگی کو قایم رکھیں تو مآل کا لفظ بیکار ہے۔ دراصل بیچارگی تو دید کی ہے نہ کہ مآل دید کی!

دیوانہ اک جہاں کو کیا ہے بہار نے اب کے تو اس بہار کو دیوانہ کیجئے

معلوم نہیں بہار کو دیوانہ کرنے سے شاعر کا کیا مطلب ہے۔ بہار نہ دیوانہ ہونے والی چیز ہے نہ بہار کو دیوانہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک شاعرانہ ادعا ہے بغیر کسی دلیل کے۔

جو ہے آمادۂ طوفِ چمن فصلِ خزاں میں بھی یہی مرحوم خاکِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

یہاں شاعر نے خاکِ آشیاں کو مرحوم کہا ہے جو نادرست ہے۔ "خاکِ آشیانِ مرحوم" ہوتا تو درست تھا۔

حسن میں اور عشق میں فرق اور اس درجہ فرق اُن کی جھلک بھی ثواب میری نظر بھی گناہ

ثواب کے لغوی معنی ہیں مزد یا جزائے خیر کے۔ سیماب صاحب نے غلطی سے ثواب کا لفظ کارِ ثواب کے معنی میں استعمال کیا ہے یا پھر انھوں نے صواب کو ثواب لکھا ہے — ثواب کا تقابل عذاب سے ہوتا ہے اور صواب کا گناہ سے، اس لئے یہاں صواب ہی ہونا چاہئے۔

اب وہ مذاقِ شانۂ و گیسو نہیں رہا اب تو خمِ خیال کو سلجھا رہا ہوں میں،

خمیدن کے معنی ہیں کج شدن، جس کو اُردو میں ٹیڑھا ہونا کہتے ہیں، اسی کا حاصل مصدر ہے "خم" اس لئے لفظ خم میں الجھنے کے کوئی معنی پیدا نہیں ہوتے اور اس کو سلجھانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ خم کے لئے نکالنا، دور کرنا، یا سیدھا کرنا بولا جاتا ہے، علاوہ اس کے "خمِ خیال"، "خیال کی اُلجھن" کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے جو درست نہیں

یہ خرامِ ناز و پیہم گردشِ دامانِ ناز اور اگر یہ حشر کا میداں خراماں ہو گیا

اول تو حشر کے میدان کا خراماں ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا دوسرے دامان کے واسطے گردش کا لفظ بالکل غیر مناسب ہے۔ خرام کے وقت دامن گردش نہیں کرتا لہذا یہ مصرع یوں ہونا چاہئے تھا: "یہ خرامِ ناز و پیہم جنبشِ دامانِ ناز"

فضا خموش، اعزہ نڈھال، تم محتاط کوئی ہمارا جنازہ اُٹھائے گا کہ نہیں

شاعر کہتا ہے کہ فضا خموش ہے، اعزہ غم کے مارے نڈھال ہیں اور تم محتاط ہو آخر کوئی ہمارا جنازہ اُٹھائیگا کہ نہیں یعنی جنازہ کیونکر اُٹھے جبکہ تم محتاط ہو، اعزہ نڈھال ہیں اور فضا خموش ہے۔ یہ تو درست ہے کہ اگر تم محتاط نہ ہوتے یا اعزہ نڈھال نہ ہوتے تو جنازہ اُٹھ سکتا تھا مگر یہ سمجھ میں نہ آیا کہ اگر "فضا خموش" نہ ہوتی تو جنازہ کیونکر اُٹھ سکتا تھا۔ فضا کی خموشی سے جنازے کے اُٹھنے کو کوئی تعلق نہیں ہے اگر یہ مصرع یوں ہوتا تو کم از کم یہ عیب تو دور ہو ہی جاتا:

"خموش دوست، اعزہ نڈھال، تم محتاط"

آشیاں میں کوئی زحمت نہ قفس میں تکلیف سب برابر ہیں طبیعت اگر آزاد رہے

شاعر کا مطلب یہ ہے کہ اگر طبیعت آزاد ہے تو آشیاں اور قفس سب برابر ہیں۔ یعنی شاعر کے نزدیک آشیاں و قفس دونوں میں زحمت اور تکلیف ہے۔ حالانکہ آشیاں تکلیف کی جگہ نہیں بلکہ راحت و سکون کی جگہ ہے۔

تجربہ رنجِ اسیری کا اُسے کیونکر ہو جو مجھے قیدِ قفس کر کے خود آزاد رہے

یہاں شاعر نے "قید" کا لفظ اسیر یا قیدی کے معنی میں لکھا ہے جو بالکل غلط ہے۔ قید کا مترادف اسیری ہے اور قیدی کا اسیر لہذا یہاں بجائے "قیدِ قفس" کے "قیدیٔ قفس" ہونا چاہئے۔

جو ہیں نو واردانِ صحنِ گلشن اُنکو دعوت دے نہ چھیڑ اے فصلِ گل دیوانۂ سرد و گریباں کو

"سرد و گریباں" غم و فکر یا ندامت کے موقع پر بولا جاتا ہے جس سے دیوانہ کو کوئی تعلق نہیں۔

ہنستا ہے کیا بجھی ہوئی شامِ حیات پر دیکھی ہے صبح بھی تو مری لالہ زار نے

لالہ کا وصف مشہور داغدار ہونا ہے اس لئے لالہ زار کی جگہ گلزار کہا ہوتا تو صحیح تھا۔

آخر نگاہِ حسن کو تکلیف دی گئی ڈورے رفوئے چاک گریباں نہ کر سکے

نگاہِ حسن "چاکِ دل" یا "چاک جگر" کو رفو کر سکتی ہے نہ کہ "چاکِ گریباں" کو۔ چاکِ گریباں تو ڈوروں ہی

سے رفو ہو سکتا ہے - ممکن ہے کہ "نگاہِ حسن" کی کارفرمائی گریبان کے چاک کو اور زیادہ بڑھنے کا موقع نہ دے مگر جہاں تک گریبان چاک ہو گیا ہے وہ تو ڈورں ہی سے رفو کیا جا سکتا ہے - علاوہ اس کے نگاہ کا کام رفو کرنا نہیں ہے لہٰذا یہاں "نگاہ" سے رفو کا کام لینا کوئی مناسبت ہی نہیں رکھتا جب تک کہ "تارِ نگاہ" نہ کہا جائے -

مطمئن گنبدِ گردوں کے سہارے پہ نہ ہو — کیا معلوم یہ کس وقت خراماں ہو جائے

شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت تو گنبدِ گردوں خراماں یعنی گردش میں نہیں ہے مگر کیا معلوم کہ یہ کس وقت خراماں ہو جائے - لفظ گردوں مرکب ہے گرد اور دوں سے گرد بمعنی گردش اور دوں کلمۂ نسبت لہٰذا گردوں میں خود حرکت کا مفہوم موجود ہے - "گنبدِ گردوں" کو یہ کہنا کہ اس وقت یہ خراماں نہیں ہے عجیب بات ہے - علاوہ اس کے خراماں ہونا گردش کرنے کے مفہوم میں یوں بھی نادرست ہے -

خونفشاں بہت دن سے لالہ زارِ ہستی ہے — شاید اس سے آزردہ کردگارِ ہستی ہے

پہلے مصرعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ لالہ زارِ ہستی "بہت دن سے" خونفشاں ہے یعنی ایک وقت ایسا بھی تھا کہ لالہ زارِ ہستی خونفشاں نہیں تھا حالانکہ ایسا کوئی زمانہ انسانی علم میں نہیں ہے کہ جب لالہ زارِ ہستی کو خونفشاں نہ کہا جا سکتا ہو - لالہ زار کے خونفشاں ہونے میں بہت دنوں یا تھوڑے دنوں کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کیونکہ لالہ زار تو فطرتاً خونفشاں ہے - اس مصرعہ میں "بہت دن سے" کا ٹکڑا صرف وزن پورا کرنے کے لئے رکھا گیا ہے اور یہ غور نہیں کیا اس کی وجہ سے مصرع میں معنوی نقص پیدا ہو گیا -

چشم و دل پر یوں نشاں باقی ہیں زخمِ عشق کے — جیسے کچھ شمعیں بجھی رکھی ہوں کاشانوں کے پاس

زخمِ عشق کا نشان دل پر تو خیر کچھ معنی رکھتا ہے مگر یہ آنکھ پر زخمِ عشق کا نشان معلوم نہیں کیا بلا ہے -

تصور اکثر اس انداز سے پرواز کرتا ہے — کہ تا حدِ نظر پردہ کوئی حائل نہیں ملتا

شاعر نے تصور کا کمال یہ دکھایا ہے کہ وہ جب پرواز کرتا ہے تو حدِ نظر تک کوئی پردہ حائل نہیں ملتا - یہ کون سے کمال کی بات ہے - حدِ نظر تک تو آنکھ بھی دیکھ لیتی ہے تصور کا کمال تو ہونا چاہئے تھا کہ حدِ نظر سے اُدھر بھی کوئی پردہ حائل نہ رہے - دوسری بات یہ کہ تصور کو نظر سے کوئی علاقہ نہیں ہے - اس لئے تصور کا حدِ نظر تک پرواز کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا

تیرے مقامِ قرب سے اس کو بھی آگہی رہی — ٹیس جگر سے جب اُٹھی تا بہ رگِ گلو گئی

جگر میں ٹیس اُٹھنا یا جگر میں درد ہونا وغیرہ محاورے میں انتہائی تکلیف کی کیفیت کو ظاہر کرتے ہیں کیونکہ جگر یا دل میں درد ہونا بے حد تکلیف دہ چیز ہے - ان الفاظ کو شعر و شاعری میں ان کے لفظی معنی کے اعتبار سے استعمال کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا - جگر سے ٹیس کا اُٹھنا تو تسلیم مگر اس ٹیس کا تا بہ رگِ گلو جانا بالکل بے معنی اور مہمل بات ہے -

وقتِ وداعِ گلشن نزدیک آ رہا ہے — اب آشیاں اُجاڑیں یا آشیاں بنائیں

شاعر کہتا ہے کہ وداعِ گلشن کا وقت نزدیک آرہا ہے اس لئے اب کیا کرنا چاہیئے ؟ آشیاں بنائیں یا آشیاں اُجاڑیں ؟ - وداعِ گلشن کے وقت دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں ایک یہ کہ آشیاں بنا ہوا ہو - دوسری یہ کہ آشیاں بنا ہوا نہ ہو - اگر آشیاں بنا ہوا ہے تو آشیاں بنائیں سے کیا مطلب اور اگر آشیاں نہیں بنا ہوا ہے تو آشیاں اُجاڑیں کے کیا معنی -

---

چمن کا چھوڑنے والا چمن میں چھوڑ آیا ہے اک ایسی بات جس کو پھول سوچے اور کلی سمجھے

معلوم نہیں کہ چمن کا چھوڑنے والا وہ ایسی کیا بات چمن میں چھوڑ آیا ہے جس کو پھول سوچے اور کلی سمجھے - اس مصرعہ سے اتنا تو ضرور پتہ چلتا ہے کہ وہ کوئی ایسی بات ہے جو پھول کی سمجھ سے دور ہے اور کلی کی سمجھ میں آنے والی ہے کیونکہ "پھول سوچے اور کلی سمجھے" کہا گیا ہے - بہت غور کرنے کے بعد بھی یہ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ بات کیا ہو سکتی ہے -

---

حسرتِ یک نگاہ کی، کیا کہوں قدر کیا ہوئی سینے کہا کبھی کبھی ، اُس نے کہا کبھی نہیں

پہلے مصرعہ میں "حسرتِ یک نگاہ" کہا گیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر محبوب صرف ایک ہی نگاہ ڈال دے تو حسرت پوری ہو جائے - پھر معلوم نہیں کہ دوسرے مصرعہ میں اسی "حسرتِ نگاہ" کے لئے "کبھی کبھی" کیوں کہا ہے یہاں صرف ایک ہی "کبھی" کافی تھا -

---

سوزِ وفا ہے ناتمام جاؤ کرو تم اپنا کام آگ بجھانے آئے ہو آگ ابھی لگی نہیں

شاعر کہتا ہے کہ ابھی آگ لگی نہیں اور تم آگ بجھانے آگئے کیونکہ سوزِ وفا ناتمام ہے - پہلے مصرعہ میں سوزِ وفا کا اقرار ہے اور دوسرے مصرعہ میں آگ لگنے سے انکار، سوز کی موجودگی اگرچہ وہ ناتمام ہی سہی یہ بتا رہی ہے کہ آگ لگی ہوئی ہو پھر یہ "آگ ابھی لگی نہیں" کہنا کیا معنی رکھتا ہے -

---

جیسے بنے سبکسر ہو دل کی داستاں سے کچھ کام لے نظر سے کچھ کام لے زباں سے

سبکسر بمعنی فرومایہ مستعمل ہے - غالباً یہاں شاعر نے سبکدوش کے معنی میں لکھا ہے جو نادرست ہے -

---

کوئی مسجد کوئی مندر سے کوئی گھر سے چلا میں بھی اُٹھ کر طرفِ حشر ترے در سے چلا

یہاں پہلے مصرعہ میں مسجد کے بعد لفظِ "سے" نہایت ضروری ہے -

دل کی دھڑکن میں سُنی رات کو تیری آواز کچھ پتہ تیرا چلا تو دلِ مضطر سے چلا

یہاں سیماب صاحب نے مضطر کا لفظ بے قرار کے معنی میں لکھا ہے جو غلط ہے - مضطر بمعنی مجبور و بیچارہ مستعمل ہے -

---

زمیں لیتی ہے انگڑائی فضائے آسمانی میں محبت جب خدا کا نام لیتی ہے جوانی میں

اول تو زمین کا انگڑائی لینا ویسے بھی کوئی معنی نہیں رکھتا اور پھر فضائے آسمانی میں انگڑائی لینا تو بالکل بے تکی سی بات ہے - دوسرے محبت اگر جوانی میں خدا کا نام لیتی ہے تو زمین انگڑائی کیوں لے اور اس کے انگڑائی لینے کا کیا مطلب ؟

بت میں بھی دیکھتا ہوں اُسی خود نما کو میں اب سجدہ برہمن کو کروں یا خدا کو میں

شاعر کہتا ہے کہ میں بت میں بھی اُسی خود نما کو دیکھتا ہوں بتاؤ اب میں کسے سجدہ کروں برہمن کو یا خدا کو؟ معلوم نہیں یہاں برہمن بیچ میں کہاں سے آگیا۔ یا تو بُت کو سجدہ کرو یا خدا کو۔ برہمن سے کیا تعلق۔

اس کشمکش میں منزلِ مقصود کیا ملے رہبر سمجھ رہا ہوں ہر اک نقشِ پا کو میں

شاعر کہتا ہے کہ میں ہر ایک نقشِ پا کو رہبر سمجھ رہا ہوں اس لئے اس "کشمکش" میں منزلِ مقصود کیا مل سکتی ہے۔ یہاں کشمکش کا لفظ غلط استعمال ہوا ہے۔ آپ تو ہر نقشِ پا کو رہبر سمجھ رہے ہیں، غلط یا صحیح بہرحال آپ ایک خاص یقین کے ساتھ چلے جا رہے ہیں یہ اور بات ہے کہ آپ منزلِ مقصود پر نہ پہونچ سکیں مگر اس میں کشمکش کی کیا بات ہے ہر نقشِ پا کو رہبر سمجھنا غلط فہمی ہو سکتی ہے اور غلط فہمی سے کشمکش نہیں پیدا ہوتی کیونکہ غلط فہمی میں ایک قسم کا یقین ہوتا ہے البتہ تذبذب کا عالم کشمکش پیدا کر سکتا ہے لہذا ہر نقشِ پا کو رہبر سمجھنا چونکہ غلط فہمی ہے، تذبذب نہیں ہے اس لئے اس سے کشمکش نہیں ہو سکتی۔

یہ مقالہ جناب سیماب کی۔ سدرۃ المنتہیٰ پر کوئی تفصیلی تبصرہ نہیں ہے، بلکہ یونہی ورق گردانی کے سلسلہ میں جو اشعار "محلِ نظر" معلوم ہوئے، انھیں پیش کیا جاتا ہے۔ اول تو تفصیلی تبصرہ کی فرصت ہی نصیب نہیں اور اگر ہو بھی تو اس طومارِ عظیم کو شایع کون کرے۔

درویش میرٹھی

شہوانیات کیا ہے؟

منجملہ ۱۲۴ عنوانات کے چند خاص عنوان ملاحظہ ہوں:

فحاشی کی تعریف اور اس کی ابتدا۔ شادی، طلاق و خلع مذہبی فحاشیاں۔ فحاشی پر عمومی تبصرہ۔ استلذاذ بالمثل۔ استلذاذ بالنفس۔ استلذاذ بالوحوش۔ فحاشی عہدِ قدیم میں۔ فحاشی قرونِ وسطیٰ میں۔ عہدِ جدید اور فحاشی۔ اخلاق جنسی۔ جنسی میلانات اور شہوانی خواہشوں پر اتنا جامع، تاریخی علمی و نفسیاتی تجزیہ آپ کو کہیں اور نظر نہ آئے گا۔ حضرت نیاز کی سالہا سال کی تحقیق و جستجو کا نتیجہ ہے اور اُردو میں سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر یہی ہے۔

حجم ۱۶۴ صفحات۔ کاغذ سفید و دبیز۔ قیمت علاوہ محصول چار روپیہ

منیجر نگار لکھنؤ

مشرقی خواتین کا بہترین ماہنامہ

"حریم" لکھنؤ

جو مسلسل ۱۹ سال سے ترقی نسواں کے لئے شایع ہو رہا ہے مغربی آزادی اور بے پردگی کے خلاف بہترین مضامین، افسانے اور منظومات شایع کی جاتی ہیں۔ ہر پرچہ میں ایک نمونہ کشیدہ کاری کے نقشہ جات کا بھی شایع کیا جاتا ہے۔ چندہ سالانہ پانچ روپیہ ہے، جس میں سالنامہ بھی شامل ہے، جسکی قیمت علٰحدہ دو روپیہ ہوتی ہے۔

منیجر "حریم" لکھنؤ

باب الاستفسار

پاکستان اور شریعتِ اسلامی

(جناب محمد رکن الدین صاحب۔ کراچی)

حال ہی میں غیر سرکاری طور پر بعض علماء کو یہاں طلب کیا گیا تھا تاکہ وہ پاکستان میں شریعت اسلامی کے رواج کے مسئلہ پر غور کریں اور اگر اس کا امکان ہو تو یہ تجویز کریں کہ اس کے اصول کیا ہونا چاہئے۔ اس سلسلہ میں جو کچھ ہوا وہ ابھی تک علم میں نہیں آیا، لیکن بعض اخبارات سے اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ ایک یادداشت مرتب کی گئی ہے اور غالباً علماء کرام کے پاس بغرض طلب رائے بھیجی جائے گی۔

حال ہی میں صدق نے مولانا مناظر احسن صاحب کا ایک خط شایع کیا ہے، اس سے بھی اس مسئلہ پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ لیکن ایک جگہ انھوں نے اشتراکیت کا ذکر کرتے ہوئے اس کے اس اُصول کی مخالفت کی ہے کہ پبلک کی دولت حکومت کی دولت سمجھی جائے اور استناداً انھوں نے کلام مجید کی ایک آیت پیش کی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ "مرد یا عورت جو کمائیں وہ انھیں کا حصہ ہے"۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس اس کی ضرورت سے زیادہ ہو، تو اسے دوسرے مستحقین کو ملنا چاہئے، جو ضعف و بیماری یا دوسرے اسباب کی بنا پر محنت کرنے سے معذور ہوں، میں سمجھتا ہوں کہ ان دونوں باتوں میں تضاد ہے۔ ازراہ کرم اپنی رائے سے مطلع فرمائیے اور شریعت اسلامی کے نفاذ کے باب میں آپ کے جو خیالات ہوں انھیں بھی ظاہر کیجئے۔

(نگار) پاکستان کے قیام سے پہلے تو یہ آواز کانوں میں اکثر آتی تھی کہ وہاں شریعت اسلامی قایم کی جائے گی اور یہ آواز ہمارے آپ کی نہیں بلکہ پاکستان کی بعض مقتدر ہستیوں کی تھی، لیکن قیام پاکستان کے بعد یہ آواز سننے میں نہ آئی۔ آپ سے معلوم ہوا کہ وہاں کے لوگوں کو اب بھی اس کا خیال ہے اور گو پاکستان کی حکومت نے اس طرف کوئی قدم نہیں اُٹھایا لیکن وہاں کی بعض جماعتوں میں اس ضرورت کا احساس پایا جاتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ کسی وقت ارباب حکومت کو بھی اس طرف متوجہ کیا جا سکے۔

شریعتِ اسلامی ہو یا غیر اسلامی، مقصد کے لحاظ سے ان سب کا نقطۂ نظر ایک ہی ہوا کرتا ہے اور وہ یہ کہ ملک میں امن و سکون قایم رہے۔ کوئی شخص دوسرے کا حق غصب نہ کر سکے اور جان و مال محفوظ رہیں گویا بہ الفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ شریعت یا قانون کا مقصود ہے انسان کو صحیح معنے میں متمدن یا نظامِ تمدن میں اس کو ایک عضو مفید بنانا۔ اور اسی چیز کو سامنے رکھ کر جرم و مجرم اور سزا و تعزیر کی تعیین و تفصیل کی جاتی ہے۔ جس کا نام عملی شریعت ہے لیکن اسوقت تک دنیا میں کوئی شریعت ایسی وضع نہیں ہوئی جس نے جرم کو دنیا سے مٹا دیا ہو اور خود لوگوں کی ذہنیت کو اس قدر بدل دیا ہو کہ وہ جرم کرنا ترک کر دیں۔ اس لئے اگر آپ شریعت اسلامی سے یہ توقع کرتے ہیں کہ وہ پاکستان کو جرم و عصیاں سے پاک کر دے گی تو صحیح نہیں کیونکہ جس زمانہ میں سنگساری، قطعِ ید وغیرہ ایسی سخت سزائیں جاری تھیں اس وقت بھی جرائم کا انسداد ممکن نہ ہوا اور اب کہ آپ بین الاقوامی تعلقات کی بنا پر اس نوع کی سزائیں دے ہی نہیں سکتے، انسدادِ جرائم کی امید رکھنا بالکل عبث ہے۔ پھر اگر آپ شریعت اسلامی کا رواج صرف اس لئے چاہتے ہیں کہ وہ ابتدائی عہدِ اسلام کی یادگار ہے تو خیر لیکن اگر مقصود جرائم کا انسداد ہے تو اس باب میں اسلامی و غیر اسلامی دونوں قوانین کی ناکامی ثابت ہو چکی ہے اور آپ کو اس کے لئے کوئی اور ذریعہ تلاش کرنا ہوگا۔

جرم و معصیت، قید و بند اور سزا و تعزیر کا مسئلہ بڑا اہم مسئلہ ہے اور عہدِ حاضر میں اس کو نفسیات کا ایک جزو قرار دیکر بڑی تحقیق و تفتیش ہو رہی ہے، جس کا مقصود مجرموں کو سزائیں دینا نہیں بلکہ ان کے ذہن سے جرم کے میلان ہی کو دور کرنا ہے اور مجرم کو تکلیف پہونچانے کی جگہ اس کی دماغی و اخلاقی حالت کی اصلاح کرنا۔

اس میں شک نہیں کہ یہ بلند مقصد کہ جرم و معصیت کا خیال تک دل سے نکل جائے، صرف مذہب کی صحیح تعلیم سے پورا ہو سکتا ہے، لیکن چونکہ ہر شخص میں یہ مذہبی روح پیدا نہیں ہو سکتی، اس لئے قیام عدل و نظم و نسق کے لئے تعزیری قوانین کا نفاذ ضروری ہوتا ہے۔

اگلے زمانہ میں جب کوئی حکومت قایم نہ تھی اور قانون ہر شخص کے ہاتھ میں تھا، سزا کی بنیاد محض طلب انتقام پر قایم تھی اور اس سلسلہ میں سزا حد سے گزر کر خود ایک سنگین جرم ہو جاتی تھی۔ اس کے بعد جب دنیا میں حکومت کی بنیاد پڑی تو سزا کے حدود بھی مقرر ہوئے، جان کا بدلہ جان سے، ناک کا ناک سے، آنکھ کا آنکھ سے وغیرہ وغیرہ اور اسی کے ساتھ جسمانی ایذا کا معاوضہ مال سے بھی ادا کیا جانے لگا۔ جب حکومت کی طاقت اور اس کا نفوذ بڑھا تو افراد سے حقِ انتقام چھیننے کے ساتھ ساتھ تخویف و ترہیب کا پہلو بھی سزا میں شامل ہو گیا۔

اس کے بعد ہیئت اجتماعیہ (سوسائٹی) نے ترقی تمدن کے ساتھ ساتھ مجرموں کے مسئلۂ سزا میں بھی بہت تبدیلیاں کیں جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان نے جس قدر ترقی تمدن میں کی ہے اسی قدر جرائم کی سزا کو ہلکا کرتا چلا گیا ہے یہاں تک کہ اٹھارھویں صدی کے آخر میں فلاسفۂ یورپ نے اس مسئلہ کو علمی اہمیت دیکر سزا کے نظریئے ہی بدل دئے۔

اے انقلاب

لباسِ آدمیت تار تار ہے کب سے
خیال و خواب سکون و قرار ہے کب سے
عذاب دانشِ ناپختہ کار ہے کب سے
خراب گردشِ لیل و نہار ہے کب سے
گزر بھی جا کہ ترا انتظار ہے کب سے

شباب پر ہیں ابھی بغض و کیں کے ہنگامے
فلک کو چوم رہے ہیں زمیں کے ہنگامے
یہ ہر قدم پہ بپا کفر و دیں کے ہنگامے
ترے لئے یہ فضا، سازگار ہے کب سے
گزر بھی جا کہ ترا انتظار ہے کب سے

بھرے ہوئے ہیں غریبوں کے خوں سے جام و سبو
جس آستین سے دیکھو ٹپک رہا ہے لہو
رُکا ہوا ہے یہ کس دن کے انتظار میں تو
حیات، حرص و ہوس کی شکار ہے کب سے
گزر بھی جا کہ ترا انتظار ہے کب سے

محبتوں میں دغا۔ دوستی میں چالاکی
نظر نظر سے نمایاں ہے دل کی ناپاکی
ہنسی میں زہر کے گن۔ قہقہوں میں سفاکی
ہوس کی جیت۔ محبت کی ہار ہے کب سے
گزر بھی جا کہ ترا انتظار ہے کب سے

گھلا کے رکھ دیا فاقوں نے ماہ پاروں کو
چمک نصیب نہیں اس زمیں کے تاروں کو
مجالِ ضبط نہیں محنتوں کے ماروں کو
مسرتوں کا چمن ہے بہار ہے کب سے
گزر بھی جا کہ ترا انتظار ہے کب سے

ابھی جو زخم ہیں باغ و بہار۔ سوکھ نہ جائیں
یہ آنسوؤں کے کہیں آبشار سوکھ نہ جائیں
ترے لئے جو گندھے ہیں وہ ہار۔ سوکھ نہ جائیں
دلوں پہ تیری جدائی کا بار ہے کب سے
گزر بھی جا کہ ترا انتظار ہے کب سے

تھکے تھکے سے ہیں اب ظلم ڈھانے والے بھی
خموش ہو گئے ڈھارس بندھانے والے بھی
اُداس ہیں تری راہیں دکھانے والے بھی
لٹی لٹی سی ہر اک رہگذار ہے کب سے
گزر بھی جا کہ ترا انتظار ہے کب سے

ادیب سہارنپوری

میں نے بھی صدق میں مولانا مناظر احسن صاحب کا وہ مکتوب پڑھا ہے، جس کا آپ نے ذکر کیا ہے اور جو اُصول انھوں نے شریعت اسلامی کے وضع کرنے کے لئے متعین کئے ہیں، ان سے میں متفق ہوں، لیکن کسب دولت کے سلسلہ میں انھوں نے جو بات کہی ہے وہ قابل غور ہے ایک طرف ہر شخص کی دولت کو اس کی تنہا ملکیت قرار دینا اور دوسری طرف ضرورت سے زیادہ دولت کو دوسرے مستحقین کا حق قرار دینا، اصولاً تو صحیح ہے لیکن اس پر عمل اسی وقت ہو سکتا ہے جب قوم کی دولت حکومت کی دولت قرار دیجائے۔ فرض کیجئے کہ میری ضروریں صرف پانسو روپیہ ماہوار میں پوری ہو جاتی ہیں اور میں کماتا ہوں ایک ہزار روپیہ ماہوار تو کیا آپ مجھ سے توقع کر سکتے ہیں کہ پانسو ماہوار کی بچت میں حکومت کے خزانہ میں داخل کرتا رہوں گا۔ آجکل ٹیکس سے بچنے کے لئے جو جو تدبیریں کی جاتی ہیں وہ آپ سے مخفی نہیں۔ اس لئے اس کا انتظام اسی وقت ہو سکتا ہے جب ہر شخص کی کمائی براہ راست حکومت کے ہاتھ میں جائے اور وہی اس کا فیصلہ کرے کہ ہماری ضرورتیں کتنی ہیں اور ہماری کمائی کا فاضل حصہ کس کس کو ملنا چاہیئے اور اسی کا نام اشتراکیت ہے۔

حضرت نیاز فتحپوری کی ایک بے مثل تصنیف

"من و یزداں"

جو اپنی انشاء عالیہ اور پرزور خطیبانہ تحریر کے لحاظ سے معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اخلاقی تعلیمات کے لحاظ سے اتنی بلند ہے کہ اُسے صحیح معنے میں انجیلِ انسانیت کہہ سکتے ہیں

اس میں مذاہب کی تخلیق، خدا کے تصور، رسالت کے مفہوم، دینی عقاید اور کتب الہامی کی حقیقت پر بسیط تاریخی، علمی، نفسیاتی اور اخلاقی بحث کی گئی ہے۔

حجم ۲۰۲ صفحات۔ کاغذ سفید دبیز۔ جلد خوشنما۔

قیمت علاوہ محصول سات روپیہ آٹھ آنے (مبلغ)

منیجر نگار لکھنؤ

تمام مذہبی استفسارات و جوابات ایک جلد میں

یعنی

"من و یزداں" کا دوسرا حصہ

زیر طبع ہے

مختصر فہرست ملاحظہ ہو:۔ سامری کون تھا۔ اصحاب کہف۔ معجزہ و کرامت۔ طوفان نوح۔ خضر کی حقیقت۔ مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں۔ یونس۔ ہاروت ماروت۔ پل صراط۔ حوض کوثر۔ آدم اور شجر ممنوعہ۔ یاجوج، ماجوج۔ لقمان۔ عالم برزخ۔ دعا و توبہ۔ بائبل و قرآن۔ تاریخ۔ مسئلہ جبر و اختیار۔ علم غیب۔ قارون۔ حسن یوسف۔ وغیرہ وغیرہ

قیمت پانچ روپیہ علاوہ محصول

پیشگی بھیجنے والوں سے صرف چار روپیہ آٹھ آنے + محصول

منیجر نگار لکھنؤ

انسداد جرائم کے سلسلہ میں اصلاح نسل کے ساتھ ہی ساتھ علم و تہذیب کی اشاعت کو بھی ضروری قرار دیا گیا چنانچہ ایک مشہور فلسفی کا قول ہے کہ "جو شخص ایک مدرسہ کھولتا ہے وہ حقیقتاً ایک قید خانہ بند کرتا ہے"۔

تعلیم کے سلسلہ میں مذہبی و تاریخی روایات، سیرت اکابر، علم الاخلاق پر خاص توجہ کی ضرورت ہے، کیونکہ ان کا مطالعہ انسان کو ارتکاب جرائم سے باز رکھنے میں بہت معاون ہو سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ عملی اور صنعتی تعلیم بھی بہت ضروری ہے کیونکہ انسان مفید پیشے سیکھنے کے بعد جرائم کی طرف بہت کم مایل ہو سکتا ہے۔

بعض مجرم ایسے بھی ہوتے ہیں جو واقعی عصبی امراض کے مریض ہوتے ہیں، ان کے لئے ایک مشہور ڈاکٹر نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ ان کے دماغی علاج کے لئے خاص شفا خانے کھولے جائیں۔ اور جن افراد کی عقلی حالت تعلیم و تربیت سے بھی درست نہ ہو سکے اور علاج بھی مفید ثابت نہ ہو ان کو دور دراز نوآبادیوں میں بھیجدیا جائے تاکہ سوسائٹی ان کے وجود سے متاثر نہ ہو۔

یہ ہے خلاصہ عہد حاضر کے ماہرین جرائم کی تحقیق کا جس سے مقصود مجرموں کے لئے سزائیں تجویز کرنے کی جگہ ان کی دماغی اصلاح کرنا ہے تاکہ وہ جرائم سے باز رہیں۔

اس میں شک نہیں کہ وہ آبادی جو جرم کرنے کا خیال ہی دل میں نہ لائے، بڑی معیاری انسانی آبادی ہے اور پاکستان کا آخری نقطۂ نظر یہی ہونا چاہیئے کہ وہ جرائم سے پاک رہے، لیکن اس کی تدبیر صرف قوانین وضع کرنا نہیں بلکہ صحیح مذہبی و اخلاقی تعلیم کو رواج دینا ہے جو عرصۂ دراز سے مسلمانوں میں مفقود ہے۔ اسی کے ساتھ دوسری چیز یہ ہے کہ جن کے ہاتھ میں عدل و انصاف کی باگ ہے وہ بہت بلند اخلاق کے ہوں۔ محض قانونی امتحان پاس کر لینا اس کے لئے کافی نہ سمجھا جائے، بلکہ ان کے تقرر کی پہلی شرط یہ ہونا چاہیئے کہ وہ صالح، متدین، پرہیزگار و متقی ہوں۔ تیسری ضروری چیز یہ ہے کہ عدل و انصاف کو ارزاں اور آسان بنایا جائے۔ انگریزی قانون اور عدالتگاہوں کا سب سے بڑا نقص یہی تھا (جو ابتک چلا آرہا ہے) کہ عدل و انصاف حاصل کرنے میں اتنا وقت اور روپیہ درکار ہوتا ہے کہ بہت سے مجرموں اور ظالموں کے خلاف چارہ جوئی ہوتی ہی نہیں۔ اس لئے سخت ضرورت ہے کہ عدالتگاہوں کے مصارف کو اگر بالکل بند نہیں کیا جا سکتا تو انھیں بہت کم کر دیا جائے اور اسی کے ساتھ اس کا خاص انتظام کیا جائے کہ وقت نہ ضایع ہو۔ حال ہی میں میں نے ایک اخبار میں پڑھا تھا کہ پشاور کی کسی تحصیل میں فریقین نے وہیں کے مقامی اکابر کو پنچ بنایا اور انھوں نے فوراً فیصلہ کر دیا۔ یہ طریقہ یقیناً بہت اچھا ہے اور ہر ہر گاؤں میں اس کو رواج دینا چاہیئے، لیکن پنچوں کا انتخاب خالص مذہبی و اخلاقی نقطۂ نظر سے ہونا چاہیئے، تاکہ وہ خالصتہً للہ فیصلہ کریں

بہرحال اگر پاکستان میں شریعت اسلامی قایم کی جائے تو ان تمام باتوں کو سامنے رکھنا ضروری ہے اور قانون سے زیادہ اس بات کو دیکھنا ہے کہ جن کے ہاتھ میں نفاذ قانون ہے وہ متدین ہیں یا نہیں۔

روسو، بنتھام اور کنٹ نے جو نظرئے پیش کئے ہیں۔ ان کی تفصیل کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ بعد کو کسی نہ کسی نقص کی وجہ سے رد کر دئے گئے، لیکن فرانس کے فیلسوف کوزن اور جیزرو کے نظریہ کو معتدل سمجھ کر فرانس میں اس پر عمل بھی کیا گیا۔ وہ نظریہ یہ تھا کہ سوسائٹی یا حکومت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی مجرم کو حد انصاف سے زیادہ سزا دے یا سزا کی اس حد سے تجاوز کرے جس سے مقصود حاصل ہو سکتا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق فرانس کے قانون میں بہت کچھ ترمیم کی گئی لیکن بعد کو اس نظریہ پر یہ اعتراض کیا گیا کہ اس میں مجرم کی شخصیت کا بڑا لحاظ کیا جاتا ہے جس سے سزا میں بہت تخفیف ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد علم الحیات کے ماہروں کو اس طرف توجہ ہوئی اور سب سے پہلے اطالیہ کے ایک عالم رولو مبروزو نے یہ نیا نظریہ پیش کیا کہ جو شخص جرم کرتا ہے وہ دراصل علیل و بیمار انسان ہے اور اس کی نہ صرف دماغی بلکہ جسمانی حالت بھی عام انسانوں سے مختلف ہوتی ہے، مثلاً ایک چور کے ہاتھ لمبے اور قاتل کے چھوٹے ہوتے ہیں۔ لیکن اس رائے کو صحیح نہیں مانا گیا کیونکہ اس طرح کوئی مجرم اپنے افعال کا ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔

علماء اجتماعین کی ایک جماعت نے جرائم کا سبب اولین ماحول اور فاسد تربیت کو قرار دیا، جو یقیناً ایک حد تک درست ہے لیکن اصل سوال کہ سزا سے انسداد جرایم کیونکر ہو سکتا ہے، اپنی جگہ پھر بھی بدستور قایم رہا، اس لئے رفتہ رفتہ بہت غور و تامل کے بعد ماہرین جرائم نے یہ طے کیا کہ جرایم روکنے کے لئے پہلے نسل کی اصلاح ضروری ہے اور اسکے بعد ماحول کی۔

تجربہ کرنے سے پتہ چلا کہ نسل کو اس مسئلہ میں بڑا دخل ہے اور اخلاقی حالت خراب کرنے کا بڑا سبب مسکرات کا استعمال ہے جو نظام عصبی کو خراب کر کے انسان میں جلد ہیجان پیدا کر دیتا ہے۔ مجرموں کی نسل کا مطالعہ کرنے کے بعد ماہرین نے پتہ چلایا ہے کہ عقلی ضعف یا جرم کا رجحان بہت کچھ والدین کی طرف سے انسان میں پیدا ہوتا ہے۔

ذیل کے نقشہ سے آپ کو معلوم ہوگا کہ عقلی ضعف کس نسبت سے والدین کی طرف سے اولاد میں منتقل ہوتا ہے[1]:

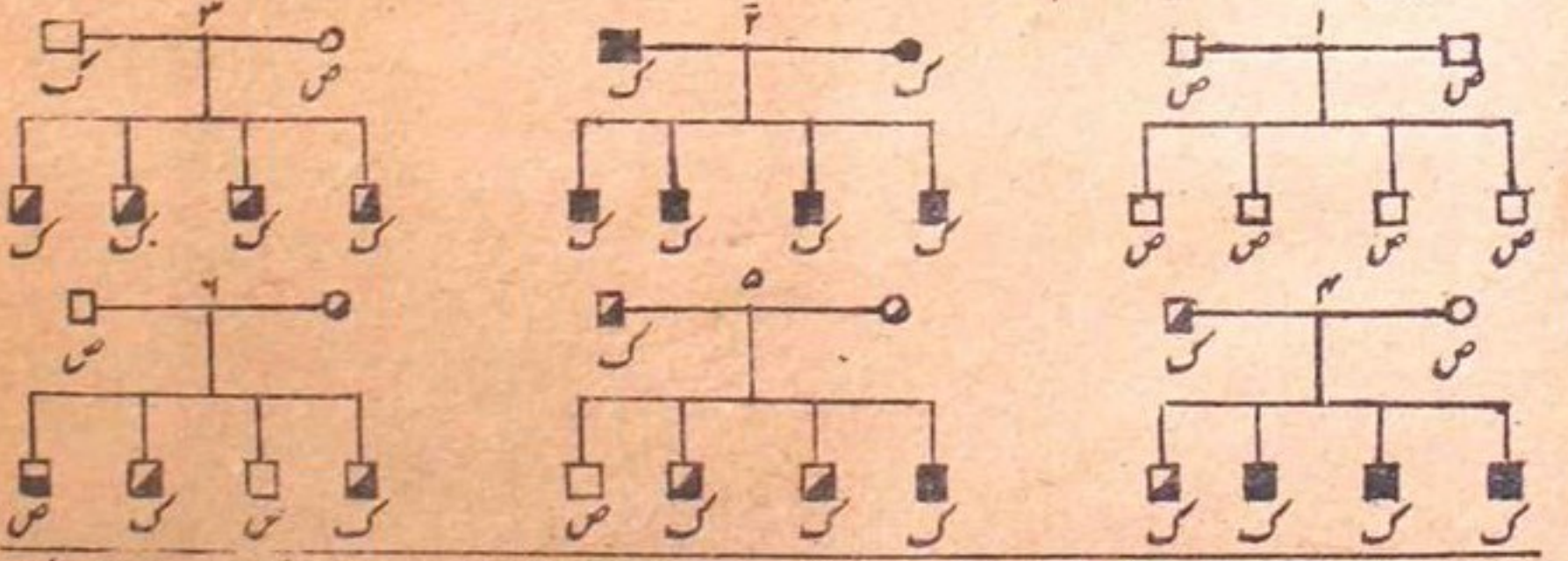

[1] اشکال مذکورہ میں دائرے عورت کی علامت ہیں اور مربعے مرد کی ۔ حرف "ص" صحت جسمانی اور سلامت عقل کی علامت ہے اور کاف عقلی و جسمانی کمزوری کی۔ جو دائرے یا مربع نصف سیاہ اور نصف سفید ہے وہ بتاتا ہے اس شخص میں بعض صفات اچھی ہیں اور بعض بری۔ مثلاً شکل اول میں والدین کی جسمانی اور عقلی حالت اچھی ہے تو اولاد بھی ان ہی کی مانند ہے شکل دوم میں والدین دونوں حیثیتوں سے گرے ہوئے ہیں تو انکی نسل بھی گری ہوئی ہے شکل سوم میں باپ برا اور ماں اچھی ہے تو اولاد میں کچھ خوبیاں اور کچھ برائیاں ہیں۔

کلام جمیلؔ :

خشک ہوتے نہیں مرے آنسو — بارہا مسکرا کے دیکھ لیا،
حسرت ہی رہ گئی کہ جہانِ خراب میں — دو دن تو زندگی کے خوشی سے گزارتے
کہاں کے پھول، نسٹیمن کہاں کا، کیسی بہار — چمن میں اب تو اُڑانے کو خاک بھی نہ رہی
اُن کی خواہش بھی یہی، عشق کا منشا بھی یہی — اپنی ہستی کو بہر حال مٹا دینا تھا
یوں کروٹوں پہ کروٹ لیتا گیا زمانہ — ہر لحظہ اک حقیقت بنتی گئی فسانہ

نازشؔ پرتابگڈھی :

دُنیا کی طلب خواہشِ عقبیٰ بھی نہیں ہے — حد یہ ہے کہ اب اُن کی تمنا بھی نہیں ہے
کچھ یہ ہے کہ اُن کو بھی کرم کی نہیں عادت — کچھ اُن کا کرم مجھ کو گوارا بھی نہیں ہے
اب تک مری زباں پہ ہے لبیک کی صدا — کیا جانے کس طرح مجھے آواز دی گئی
ہلکی سی چاندنی تھی فضائیں خموش تھیں — نازشؔ اُسی سکوت میں اک آہ کی گئی
آج پھر بے مہریٔ اہلِ وطن یاد آگئی — مجھ کو نازشؔ لذتِ دردِ کہن یاد آگئی
جب بزرگوں نے کسی کو دی ہے جینے کی دُعا — مجھ کو اپنی زندگیٔ پرمحن یاد آگئی

رُباعی ۔ شادؔ بنگلوری

ہر ذرّے کے پیکر میں خوشی ہوتی ہے — ہر چیز محبّت سے بھری ہوتی ہے
جس سمت نظر جُھک گئی اُن کی اے شادؔ — کونین اُسی سمت جُھکی ہوتی ہے

نگار بک ایجنسی کی جدید مطبوعات

مکتوبات نیاز (تیسرا حصہ) - انشائے لطیف، انتقاداتِ عالیہ، ندرتِ بیان، سلاستِ زبان اور اُردو فارسی اشعار کا وہ بیش بہا ذخیرہ جو دنیائے ادب میں سحر طراز اور معجزہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ۲۰ پونڈ کے دبیز اور چمکیلے کاغذ پر حضرت نیاز کی تصویر کے ساتھ خوشنما جلد میں معہ دو رنگ کے گرد پوش کے۔ قیمت علاوہ محصول چار روپیہ

ماہ و ما علیہ - دورِ حاضر کے بعض اکابر شعراء کے کلام کا خورد بینی مطالعہ، جس میں حضرت نیاز نے جوش، سیماب، جگر، ماہر اور وحشت وغیرہ کے کلام کو سامنے رکھ کر معنی و بیان اور فنِ عروض کے نقطۂ نظر سے گفتگو کی ہے۔ وہ حضرات جو معیاری شاعری کی خصوصیات معلوم کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے اس کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔ — قیمت علاوہ محصول دو روپیہ۔

گوہر - نظیر جمیلی ام۔اے کا ناول جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ زن و شو کی عمر کا تفاوت کتنے خراب نتائج پیدا کرتا ہے اور سماج کا یہ رواج کہ محض مروت یا دولت کی لالچ میں کسی کمسن لڑکی کو معمر شخص سے بیاہ دیا جائے کتنا بڑا ظلم ہے، ناول اپنی زبان، پلاٹ اور جذبات کے لحاظ سے موتیوں میں تولنے کے قابل ہے اور اس کی خوبی کی ضمانت یہی ہے کہ اسے نگار بک ایجنسی نے شایع کیا ہے — قیمت ایک روپیہ۔

ناول کیا ہے (زیرِ طبع) یہ کتاب ڈاکٹر محمد احسن فاروقی ام۔اے، پی۔ایچ۔ڈی اور ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی ام۔اے، پی ایچ۔ڈی اساتذۂ لکھنؤ یونیورسٹی کی متحدہ کوشش کا نتیجہ ہے جس میں ناول کی تشکیل، اسکے عناصرِ ترکیبی، اسکے اقسام فنی اہمیت کے کردار و پلاٹ کی تقسیم اور اسکے محاسن و معائب، اُردو ناول نویسی کی تاریخ اور اسکے حال و مستقبل پر نہایت سہل زبان میں اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اگر آپ کسی ناول کے مطالعہ کے بعد اس کے حسن و قبح کو سمجھنا چاہتے ہیں یا خود کامیاب ناول نگار بننا چاہتے ہیں تو اس کا مطالعہ ضروری ہے۔ قیمت دو روپیہ

قولِ فیصل (زیرِ طبع) - حضرت علی اختر اختر حیدر آبادی کی ایک معرکۃ الآرا نظم جس میں شاعر و شیطان کو ایک دوسرے کا فریق قرار دیکر کائنات کے خیر و شر، مذہب و اخلاق کی ضرورت اور فلسفۂ تکوین کو پیش کرتے ہوئے خدا اور اسکی حقیقت پر نہایت حکیمانہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ حضرت اختر اسوقت ہندوستان کے تنہا فلسفی شاعر ہیں، جو پختگی کلام، علوئے فکر اور خیالات کی گہرائی کے لحاظ سے اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ایک ایک شعر موتی کی لڑی ہے اور اسکا ہر ہر لفظ جڑا ہوا نگینہ، یہ نظم ایک ہزار سے زیادہ اشعار پر مشتمل ہے۔ بہترین طباعت و کتابت کے ساتھ ۲۸ پونڈ کے دبیز کاغذ پر معہ رنگین گرد پوش کے شایع ہو رہی ہے حضرت اختر کا دیباچہ اور انکی تصویر بھی اس میں شامل ہے۔ قیمت دو روپیہ

صرف اخیر اگست ۴۸ء تک

مکتوبات نیاز اور ماہ و ما علیہ دونوں طیار ہیں اور ان کی روانگی شروع ہو گئی ہے جو حضرات یہ دونوں کتابیں ایک ساتھ طلب کریں گے اُن سے چھ روپیہ کی جگہ معہ محصول ڈاک صرف پانچ روپیہ لئے جائیں گے۔ یہ رعایت صرف اخیر اگست تک - اس کے بعد یہ رعایت بند ہو جائے گی۔

منیجر نگار لکھنؤ